چراغِ نیم شب

سلیم احمد



چراغِ نیم شب

سلیم احمد

مکتبۂ اسلوب کراچی

چراغِ نیم شب

"چراغِ نیم شب" بھائی صاحب کا آخری مجموعۂ کلام ہے اور اس میں وہ غزلیں شامل ہیں جو انھوں نے "اکائی" کے بعد کہی تھیں گویا "چراغِ نیم شب" میں ۱۹۸۲ء سے ۷ ستمبر/اگست ۱۹۸۳ء تک کے عرصے کی غزلیات شامل ہیں۔ یہ بھائی صاحب کی تخلیقی زندگی کا بڑا اہم دور ہے۔ اس مختصر سی مدت میں انھوں نے نظم و نثر میں جتنا لکھا، اتنا کبھی نہیں لکھا تھا۔ آخری برسوں میں اُن میں ایک عجیب سی غیر معمولی خواہش پیدا ہوگئی تھی کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور مجھے بس دو تین سال میں سب کچھ کر دینا چاہیے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اس دور کی تمام غزلیں کتابی صورت میں ۱۹۸۳ء میں ہی شائع ہو جائیں۔ چنانچہ اس مجموعے کی کتابت و طباعت کا انتظام اُن کی زیرِ نگرانی تیزی سے ہو رہا تھا ــــ مگر افسوس کہ یہ کتاب اُن کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔

میری یادداشت کا جہاں تک تعلق ہے، اُن کی شاعری کا آغاز ۱۹۴۲ء میں ہوا تھا۔ ابتدا میں اُنھوں نے غزلیں ہی کہی تھیں۔ ۱۹۴۴ء سے انھوں نے نظمیں کہنی شروع کی تھیں، لیکن ۱۹۴۷ء میں پھر وہ غزلوں کی طرف پلٹ آئے تھے۔ اور جب سے اُنھوں نے ہر صنف کو برتنے کی کوشش جاری رکھی۔ اس کا صحیح اندازہ اُس وقت ممکن ہو سکے گا جب "مشرق" اور اُن کی شاعری کی باقیات کا مجموعہ شائع ہو جائے گا۔

اُن کی غزلوں کے ارتقائی مراحل اُن کی پوری زندگی کو محیط ہیں۔ ابتدا میں انھوں نے رومانی انداز کی غزلیں کہیں، پھر اقبال کا اثر قبول کیا اور ۱۹۴۷ء میں میر، حسرت اور فراق کے رنگوں کا اُن کی شاعری پر اثر نمایاں ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے کلاسیکی غزل کے ہر منفرد شاعر سے دوبارہ رشتہ جوڑنے کی کوشش اور شعوری طور پر اُنھیں دوبارہ دریافت کرنے کی سعی جاری رکھی۔ اس طرح اُن کی شاعری میں سودا اور آتش سے لے کر یگانہ تک کئی رنگ مل جائیں گے۔ "بیاض" کی اشاعت سے قبل اُنھوں نے اپنے لب و لہجہ کو تبدیل کرنے کی ایک بڑی سعی کی جس سے بعد میں اُن کی شاعری کا اپنا لب و لہجہ بننے میں بڑی مدد ملی۔ "اکائی" کی غزلوں میں اس کے نتائج کو دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن "چراغِ نیم شب" کی غزلیات میں میرے خیال کی حد تک اُنھوں نے اپنی اس آواز کو پایا تھا جس کے لیے اُنھوں نے ایک طویل مسافت اختیار کی تھی۔

شمیم احمد

Printed by Mehran Process 215885 KARACHI PAKISTAN

چراغِ نیم شب

"چراغِ نیم شب" بھائی صاحب کا آخری مجموعۂ کلام ہے اور اس میں وہ غزلیں شامل ہیں جو انھوں نے "اکائی" کے بعد کہی تھیں، گویا "چراغِ نیم شب" میں ۱۹۸۲ء سے ۷ اگست ۱۹۸۳ء تک کے عرصے کی غزلیات شامل ہیں۔ یہ بھائی صاحب کی تخلیقی زندگی کا بڑا اہم دور ہے۔ اس مختصر سی مدت میں انھوں نے نظم و نثر میں جتنا لکھا، اتنا کبھی نہیں لکھا تھا۔ آخری برسوں میں اُن میں ایک عجیب سی غیر معمولی خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور مجھے بس دو تین سال میں سب کچھ کر دینا چاہیے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اس دور کی تمام غزلیں کتابی صورت میں ۱۹۸۳ء میں ہی شائع ہو جائیں۔ چنانچہ اس مجموعے کی کتابت و طباعت کا انتظام اُن کی زیرِ نگرانی تیزی سے ہو رہا تھا ـــــ مگر افسوس کہ یہ کتاب اُن کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔

میری یادداشت کا جہاں تک تعلق ہے اُن کی شاعری کا آغاز ۱۹۴۲ء میں ہوا تھا۔ ابتدا میں اُنھوں نے غزلیں ہی کہی تھیں۔ ۱۹۴۴ء سے انھوں نے نظمیں کہنی شروع کی تھیں، لیکن ۱۹۴۷ء میں پھر وہ غزلوں کی طرف پلٹ آئے تھے۔ اور جب سے اُنھوں نے ہر صنف کو برتنے کی کوشش جاری رکھی۔ اس کا صحیح اندازہ اُس وقت ممکن ہو سکے گا جب "مشرق" اور اُن کی شاعری کی باقیات کا مجموعہ شائع ہو جائے گا۔

اُن کی غزلوں کے ارتقائی مراحل اُن کی پوری زندگی کو محیط ہیں۔ ابتدا میں انھوں نے رومانی انداز کی غزلیں کہیں، پھر اقبال کا اثر قبول کیا اور ۱۹۴۷ء میں میر، حسرت اور فراق کے رنگوں کا اُن کی شاعری پر اثر نمایاں ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے کلاسیکی غزل کے ہر منفرد شاعر سے دوبارہ رشتہ جوڑنے کی کوشش اور شعوری طور پر اُنھیں دوبارہ دریافت کرنے کی سعی جاری رکھی۔ اس طرح اُن کی شاعری میں سودا اور آتش سے لے کر یگانہ تک کئی رنگ مل جاتے گئے۔ "بیاض" کی اشاعت سے قبل اُنھوں نے اپنے لب و لہجہ کو تبدیل کرنے کی ایک بڑی سعی کی جس سے بعد میں اُن کی شاعری کا اپنا لب و لہجہ بننے میں بڑی مدد ملی۔ "اکائی" کی غزلوں میں اس کے نتائج کو دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن "چراغِ نیم شب" کی غزلیات میں میرے خیال کی حد تک اُنھوں نے اپنی اس آواز کو پا لیا تھا جس کے لیے انھوں نے ایک طویل مسافت اختیار کی تھی۔

شمیم احمد

Printed by Mehran Process 715685 KARACHI PAKISTAN

سلیم احمد

کھیولی (ضلع بارہ بنکی، یو پی) میں ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ نو برس کے تھے کہ والد (سید شرافت علی) کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ابتدائی تعلیم کھیولی، اُس کے بعد قریبی قصبات اور لکھنؤ میں حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں میرٹھ چلے گئے اور وہاں فیضِ عام انٹر کالج میں نویں جماعت میں داخل ہوئے۔ میٹرک کے بعد میرٹھ کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں پروفیسر کرار حسین، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر جمیل جالبی اور انتظار حسین سے تعلقات استوار ہوئے جو اُن کی آیندہ ذہنی اور ادبی زندگی پر خاصے اثر انداز ہوئے۔ انٹر میں پڑھ رہے تھے کہ پاکستان بن گیا۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں کراچی آ گئے۔ نئے حالات میں تعلیم جاری نہ رہ سکی اور فکرِ معاش دامنگیر ہوئی۔ ابتدا میں مختلف ملازمتیں کیں۔ بالآخر ۱۹۵۰ء میں ریڈیو پاکستان سے بطور اسکرپٹ رائٹر منسلک ہوئے۔ وفات (یکم ستمبر ۱۹۸۳ء) کے وقت وہ اس ادارے میں سینئر پروڈیوسر تھے۔ ۱۹۷۸ء میں کچھ عرصے کے لیے وزارتِ اطلاعات، حکومتِ پاکستان کے مشیر بھی رہے۔

۱۹۴۲ء میں شاعری کا آغاز ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں تنقیدی مضامین لکھنے شروع کیے۔ ریڈیو کے لیے بے شمار فیچر، ڈرامے اور دوسرے پروگرام لکھے۔ ٹیلی وژن کے لیے متعدد ڈرامے تحریر کیے جو بے حد مقبول ہوئے۔ فلمی دنیا سے بھی تعلق رہا۔ کئی فلموں کی کہانیاں، مکالمے اور گانے لکھے۔ کراچی کے دو روزناموں "جسارت" اور "حریت" میں سالہا سال کالم نگاری کی۔ مندرجہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

۱۔ ادبی اقدار (تنقیدی مضامین) ۱۹۵۶ء
۲۔ بیاض (شاعری) ۱۹۶۶ء
۳۔ نئی نظم اور پورا آدمی (تنقیدی مضامین) ۱۹۶۲ء
۴۔ غالب کون؟ (تنقید) ۱۹۷۱ء
۵۔ ادھوری جدیدیت (تنقیدی مضامین) ۱۹۷۷ء
۶۔ اقبال ایک شاعر (تنقید) ۱۹۷۹ء
۷۔ اکائی (شاعری) ۱۹۸۲ء
۸۔ محمد حسن عسکری۔ آدمی یا انسان؟ (تنقید) ۱۹۸۲ء
۹۔ اسلامی نظام۔ مسائل اور تجزیے (مضامین) ۱۹۸۴ء
۱۰۔ چراغِ نیم شب (شاعری) ۱۹۸۵ء

سلیم احمد کے کالموں، ڈراموں، تنقیدی مقالوں، مذہبی و معاشرتی موضوعات پر مضامین کے اور شاعری کے کئی مجموعے اشاعت کے انتظار میں ہیں۔ طویل نظم "مشرق" بھی ابھی تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئی۔

اشاعت اوّل	۱۹۸۵ء
سرورق	لیاقت حسین
طابع	عظیمی پرنٹرز۔ ناظم آباد۔ کراچی
قیمت	۳۰ تیس روپے

مکتبہ اسلوب

پوسٹ بکس ۲۱۱۹۔ کراچی ۱۸

اطہر نفیس کے نام

جو میرے لیے ہمیشہ زندہ رہے گا

فہرست

سلیم احمد

بہ پائے جستجو چوں آبلہ خوں گشت منزل ہا

سراج منیر

راویانِ روایت کا کہنا ہے کہ واقعہ میرٹھ میں پیش آیا جہاں کے قینچی، کباب اور کرار حسین مشہور ہیں۔ فسادات کا زمانہ تھا۔ عسکری، انتظار حسین اور سلیم احمد چلے جا رہے تھے۔ شہر میں سکھ شرنارتھیوں کے گروہ وارد ہونا شروع ہو چکے تھے اور قتل و غارت کا آغاز ہو گیا تھا۔ یکایک ایک جٹا دھاری سکھ ہاتھ میں کرپان لیے آتا دکھائی دیا۔ عسکری صاحب نے کہا "کیوں بھئی کوئی اس سے بات کرنے کی ہمت کر سکتا ہے؟" انتظار حسین کی تو خوف سے گھگھی بندھ گئی۔ البتہ سلیم احمد نے کہا میں اس سے خطرناک سے خطرناک بات کہہ کر واپس آ سکتا ہوں۔ یہ کہا اور سکھ کے پاس پہنچ گئے۔ اس کی کرپان کا بغور معائنہ فرمایا اور کہنے لگے "کیوں بھئی، یہ کرپان بیچتے ہو۔ کتنے کی ہے؟" ایک تو سکھ اوپر سے شرنارتھی، آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ سلیم احمد نے کہا۔ "معاف کرنا یار ذرا غلط فہمی ہو گئی تھی" یہ کہا اور یہ جادہ جا۔ اُس وقت سے آج تک سلیم احمد کا طور بدلا نہیں۔ ادبی تنقید میں آئے۔ جہاں کوئی سکھ کرپان لیے دکھائی دیا اس کے پاس پہنچ گئے۔ "کیوں بھئی بیچتے ہو؟" ادھر اُس کے مُنہ سے کف جاری ہوا اور آپ واپس عسکری صاحب کے پاس۔ "دیکھیے میں اُسے چڑا آیا۔" ہر بار انتظار حسین کی خوف سے گھگھی بندھ جاتی ہے۔

مجھے پہلے فقرے میں میرٹھ کے مشاہیرِ ثلاثہ گنوانے کی ضرورت نہ پڑتی اگر یہ چیزیں سلیم احمد کی شخصیت میں یکجان نہ ہو جاتیں۔ فولادی قینچی کی کاٹ، کباب کی تیز مرچیں اور کرار صاحب کی نکتہ آفرینی اور تجزیاتی مہارت ــ یہ ہیں سلیم احمد کی شخصیت کے

ابعادِ ثلاثہ۔ میں نے یہ بات اتنی سہولت سے کہہ دی جیسے اس کے ذریعے سلیم احمد کی پوری شخصیت گرفت میں آجائے گی۔ حالانکہ اس شخص نے اپنے آپ کو اس قدر بکھیر رکھا ہے کہ چند صفحوں میں کیا، کتابوں میں سمیٹنا محال ہے۔ بکھیرنے کی اصطلاح بھی میں نے ان کے دردمند دوستوں سے مستعار لی ہے جو اُن کی غیر موجودگی میں ایک اندوہ کے ساتھ سر ہلا ہلا کر اس لفظ کا ورد کرتے ہیں، ورنہ سلیم احمد سے زیادہ منظم آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ اخبار کے کالم سے شعر تک، ڈرامے سے تنقیدی مضمون تک، سیاسی مضامین سے مابعد الطبیعیاتی مباحث تک۔ ہر چیز یا تو ایک اصول کے تحت مربوط ہے یا ہو رہی ہے۔ اس شخصیت کے اندر ایک زبردست مرکز گریز اور اتنی ہی قوی مرکز جو قوت، بیک وقت عمل پیرا ہے اور ہر لمحہ ان کے درمیان ایک نئے نقطۂ توازن کی دریافت کا نام سلیم احمد ہے۔ سوچنے والے کے لیے برلن پتھر کی طرح سیل جانا یا بم کی طرح پھٹ کر تباہی پھیلا دینا، دونوں چیزیں آسان ہوتی ہیں۔ وہ جو ادب میں بہت طمطراق سے داخل ہوئے تھے، اور اب عرصے سے یوں ہیں کہ ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں، وہ پہلی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ جو یوں آئے جیسے برق خاطف گرتی ہے، مگر لمحے بھر بعد کچھ بھی باقی نہیں رہتا، وہ دوسری قسم سے ہیں۔ اصل میں مشکل کام ایٹمی ری ایکٹر بنے رہنا ہے۔ تابکار رہنا اور تابکاری پھیلاتے رہنا۔ اس میں شخصیت ٹوٹتی رہتی ہے اور جڑتی رہتی ہے۔ ذرّہ ذرّہ ٹوٹتا ہے اور پھر جڑتا ہے۔ اتنی حدت پیدا ہوتی ہے کہ لوہے کو گیس بنا دے لیکن اس کا براہِ راست ظاہر ہونا ممنوع ہے۔ یہ اپنی آگ میں خود کو بار بار پگھلانے اور بار بار ڈھلنے کا عمل ہے۔ ایسا عمل کہ زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک۔ فی زمانہ یہ کام، خودگری اور خودشکنی کا ناختم عمل، سلیم احمد کے حصے میں ہی آیا ہے ورنہ اکثر کا عالم تو یہ ہے کہ شخصیت کا جو بُت ۱۸ سال کی عمر میں بن گیا تا عمر اسی کے سامنے سربسجود رہے، اور اسی کے معبد کے دائرے کو وسیع کرتے رہے۔ مجھے احساس ہے کہ ری ایکٹر والی مثال سے اس تحریر میں ذرا رومانوی خطابت سی پیدا ہو گئی ہے لیکن یہ اس لیے ضروری ہے کہ تحریر "کلاسکیت

کے سرطان" سے محفوظ رہے۔

ایلیٹ نے اپنی نظم میں آدھی سطر بہت مزے کی لکھ دی ہے:

To fix in a formulated phrase

لکھنے والوں کی رائج الوقت توضیح یہی ہے۔ ترقی پسند، رجعت پسند، کلاسیکی، رومانی، جدیدیت پرست، روایت پسند۔ کیا کیا مہریں ہیں جو الگ الگ لفافوں پر لگی ہوئی ہیں اور یہ سب لفافے اپنے اپنے پوسٹ بکسوں میں رکھے ہوئے ہیں۔ کسی کو اس بات کی پروا نہیں ہے کہ لفافے کے اندر کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا کیا ہے۔ نگاہ صرف پوسٹ بکس نمبر دیکھتی ہے اور ہاتھ مہر لگاتے ہیں۔ اس صورت حال میں اگر کسی کو Formulated Phrase میں متعین نہ کیا جا سکے تو ایک لمحے کو سارا عمل درہم برہم ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کا پتھریلا پن اور ہاتھوں کی میکانیکی حرکت، دونوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ مہر بیکار ہو جاتی ہے اور ذہن سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ کون ہے۔ اس کی شناخت کیا ہے، اسے کس خانے میں رکھوں۔ اگر ایک قدم اور آگے بڑھ جائے تو اگلا سوال ہو گا۔ میں کون ہوں؟ یہی شہادت گہ الفت میں قدم رکھنے والا معاملہ ہے۔ آدمی یہاں تک پہنچنے کے خوف سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی مہر لفافے پر رسید کر دیتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ غلط کر رہا ہے، مگر دوسرا راستہ شناخت کی طرف جاتا ہے۔ عذاب کی طرف جاتا ہے۔ ایک لفافے نے مشینی آہنگ سے جاری یکسانیت کو توڑ دیا۔ مہر لگانے والا زیرِ لب گالیاں دیتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ۔ ٹھک ٹھک، ٹھک ٹھک۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو ———— Crystallise نہیں ہونے دیتے، زندگی کی طرح متحرک رہتے ہیں، متغیر، ہمہ وقت نئے امکانات کے جویا، وہ معاشرے کے لیے شناخت کا مسئلہ پیدا کر دیتے ہیں۔ جلّاد اگر ایک لمحے کو پوچھ لے کہ تختے پر کون ہے تو دوسرا سوال اس کے اپنے بارے میں ہو گا۔ میں کون ہوں؟ پھر وہ نوکری سے جائے گا۔ ادب میں یہ سوال پوچھ کر آدمی شاعری سے جاتا ہے، تنقید سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

محض یہ جاننے کے لیے کہ میں کون ہوں۔ برسوں کی محنت اکارت نہیں کی جا سکتی۔ آپ دیکھتے نہیں لوگ عسکری صاحب سے کس قدر ناراض رہتے ہیں کہ وہ اپنی رائے بدل لیا کرتے تھے۔ ان کا ذہنی طور پر زندہ اور متحرک رہنا لوگوں کے لیے شناخت کا مسئلہ پیدا کرتا تھا اور ان کی عیاشی۔

Fix in a formulated phrase

میں عمل ہوتا تھا۔ سلیم احمد، عسکری صاحب کی طرح رائے نہیں بدلتے لیکن ان سے کہیں زیادہ Elusive ہیں۔ ان کے ہاں متضاد عناصر یکجان ہونے کی کوشش میں ہیں۔ ایک ماورا اور منزّہ اصول کے تحت، لفافے والی تشبیہ آگے بڑھائیے، اس لفافے پر سارے پوسٹ بکس نمبر لکھے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان ایک سرّی فیثا غوری کلید ہے لیکن مہریں لگانے والے کو کیا پتا۔ بیچارہ بھونچکا ہو گیا ہے اور اب زور زور سے گالیاں دے رہا ہے، لفافے کو، پوسٹ بکس نمبروں کو اور گالیاں دے گا ہے خود کو بھی۔ رائخ نے لکھا ہے کہ جب میں تحلیلِ نفسی کے ذریعے کسی شخص کو اس کی شخصیت کے مرکز سے قریب کرنے لگتا ہوں تو اس کا پہلا ردّ عمل شدید غصّے کا ہوتا ہے اور اکثر وہ مجھ پر ہی بگڑ بیٹھتا ہے۔ سلیم احمد بھی ہمارے معاشرے کے ماہرِ نفسیات ہیں۔ پاؤنڈ نے جو کہا ہے نا کہ معاشرہ سب سے زیادہ فنکار کے چلبلے پن سے ڈرتا ہے، وہ اسی لیے کہ چلبلا فنکار اُسے اُس کی مرکزی شخصیت کی طرف لے جاتا ہے۔ لگام سے کھینچ کر نہیں۔ ہشکار ہشکار کے۔ بعض بزرگ اس میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔

معاشرے کے ماہرِ نفسیات ہونے کا دعویٰ بہت لوگوں کو ہوتا ہے۔ یہ ایک ذہنی بیماری ہے Paranoid Formation. کی قبیل سے۔ خبطِ عظمت سلیم احمد کو یہ دعویٰ نہیں ہے، وہ تو بس اپنی شخصیت کے تانے بانے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ذات کے گرد ایک حجاب سا بنتے ہیں، پھر اُدھیڑ کر اس کا معائنہ کرتے ہیں۔ انھیں دھاگوں سے پھر ایک نیا پیٹرن بناتے ہیں۔ پھر اس میں کچھ اور نقش و نگار

رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا دوبارہ اُدھیڑ کر اسے پھر ایک نئے انداز میں بُننا شروع کرتے ہیں۔ یہ Penelope والا طریقۂ کار ہے۔ یونانی دانش کی ازلی تلاش Know thyself ذات کے اصل اصول تک پہنچنے سے پہلے پہلے تک یہ چیز جاری رہنی چاہیئے۔ جس دن اصل اصول کی بازیافت ہو جائے گی، اس دن چادر بھی مکمل ہو جائے گی۔ چونکہ یہ تانا بانا معاشرے سے، تاریخ و تہذیب سے، ادب سے، شاعری سے فراہم ہوا ہے لہٰذا اس کے مطالعے کے ضمن میں ہر سرچشمہ آ جاتا ہے۔ یہاں ہر تنکے کا معاملہ یہ ہے کہ ہوا ریشہ نیستاں کا۔ انسانی تاریخ و تہذیب کی گہرائی تئیں سفر کرنے کے معنی ہیں اپنی ذات کی تہوں میں اُترنا اور ایک تہہ سے دوسری تہہ تک پہنچنے کا مطلب ہے سنگین دیواریں در بنانا۔ اپنے آپ کو توڑ کر، کاٹ کر، اُسے سمجھنا اور اُسے ایک شکل دینا۔ یہی سلیم احمد کی بنیادی تلاش ہے۔ اسی مرکزی نقطے سے سارے دائرے پھوٹتے ہیں۔ اور ایک ہی نقطے کے گرد وسیع ہوتے جاتے ہیں۔ متضاد سمتوں کو سمیٹتے ہوئے، عناصرِ مختلفہ کو ایک مرکزی حوالہ دے کر مربوط اکائی بناتے ہوئے۔ کسری آدمی سے مکمل آدمی تک سفر ہی اس زمانے کا سلوکِ علمی ہے۔ دائرہ، مرکز اور محیط کی علامتوں کے ذریعے Operate کرتا ہے۔ کسری آدمی کی شخصیت کا اصول مستطیل اور مربع ہے۔ مربع کے ساتھ مربع جوڑ دیجیے، ایک اقلیدسی شکل وجود میں آ جائے گی لیکن اس کا کوئی مرکزی اصولِ حیات نہیں ہوگا۔ حیاتیاتی سانچے ہمیشہ دائرے کی شکل میں حرکت کرتے ہیں۔ ”کسری آدمی کا سفر“ سلیم احمد کا معرکۃ الآرا نظریہ تو ہے ہی، ہمارے زمانے کی اہم ترین کلید بھی یہی ہے۔ کچھ لوگ اس دعوے سے جز بز ہوں گے۔ لیکن ان کی ناراضگی قابلِ فہم ہے۔ کسریت سے اضافیت پیدا ہوتی ہے اور معاشرے میں اضافیت ذاتی اَنا کے ذریعے رو بہ عمل آتی ہے۔ اضافیت زدہ ذہنی فضا میں Superlative کا استعمال بہت ناگوار ہوا کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں مطلق کی مشابہت پائی جاتی ہے جو اضافیت کے لیے مہلک ہے۔ اس خطرے کے باوجود میں اصرار کرتا ہوں ”کسری آدمی کا سفر“ اردو تنقید میں مابعد الطبیعاتی

پیمانے کا نظریہ ہے۔ منظم، مربوط، اہم ترین!

بیسویں صدی میں انسانی اکائی کی شکست ایک ایسی نمایاں صورت حال ہے جس کی طرف کم و بیش ہر بڑے لکھنے والے نے اشارہ کیا ہے۔ بعض اس اصل عمل کی طرف رہ نمائی کرتے ہیں اور بعض اس کے نتائج کی طرف۔ اس میں بیسویں صدی کی قید بھی غیر ضروری ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت نمایاں اشارے دکھائی دے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی میں قطبین بہت حد تک واضح ہو گئے ہیں اور اس شکست کی خشت اول نشاۃ علوم کے دور میں رکھی جا چکی ہے۔ ہملٹ میں اس کے ابتدائی نقوش مل جائیں گے۔ Time is out of joint

انیسویں صدی میں نطشے کے ہاں شخصیت کے اندر ایک بہت Explosive قوت کی موجودگی کا احساس واضح ہے۔ مگر ادب کی سطح پر اس کے ابتدائی نقوش ہارڈی کے ہاں ہیں یا پھر لارنس نے تو اس کا بیان بہت شرح و بسط سے کیا ہے۔ لارنس کے ہاں سارے تصورات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کا مقصد ہی لارنس نے یہ قرار دیا ہے کہ وہ پورے آدمی کا قصہ بیان کرے۔ صرف روح، محض جسم یا ذہن، یہ سب کچھ ایک ساتھ، ایک تناظر میں۔ لارنس کا یہ احساس بہت منجلا ہے لیکن اس کی نظریہ سازی غلط ہے۔ لارنس کے پہلو بہ پہلو نفسیات کے سارے دبستان انسان کا مطالعہ جس انداز میں کرتے نظر آتے ہیں وہ بھی اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے۔ نفسیات نے انسان کی تقسیم جس طرح مختلف خانوں میں کی اس میں وہ اہم ترین نکتے کا جواب دینے سے قاصر رہی۔ حقیقتِ انسانیہ کیا ہے، وہ کیا مرکز ہے جس کے گرد انسانی ذات کے یہ دائرے ترتیب پاتے ہیں۔ نفسیات کا انسان آخر الامر ایک حیوانی وجود ہے۔ یہ علم انسان کو حیاتیاتی اصطلاح سے آگے نہیں پہچان پاتا۔ انسان کے ضمن میں "He himself" کی اصطلاح استعمال کر کے اس کی تشریح میں راکج نے وہ غوطے کھائے ہیں کہ لطف آ جاتا ہے۔ کاش یہ لوگ دنیا کی کسی روایت میں حقیقت انسانیہ سے متعلق ابتدائی معلومات حاصل کر لیتے۔ اسلام نہ سہی، ہندو مت تو رائج کے تقریباً گھر کی چیز تھی، عیسائیت کے حوالے بھی کم موجود نہیں تھے۔ لیکن یہ سارے

نفسیات داں بار بار اصرار کرتے ہیں کہ یہ سب تجربی صداقتیں ہیں۔ درست۔ ہم ان کی محنت کو سلام کرتے ہیں۔ لیکن تجربی صداقت کبھی مکمل سچائی تک یا حقیقت تک نہیں پہنچا سکتی۔ اس کا دائرہ کار Fact ہے۔ خیر اس گریز کے بعد ہم اصل مسئلے یعنی کسری انسان کے اس تصور کی طرف لوٹتے ہیں جو سلیم احمد نے پیش کیا ہے۔

"نئی نظم اور پورا آدمی" لکھتے وقت سلیم احمد کو مسئلے کی اصل نوعیت کا فہم تھا اور دادب میں وہ اس کے اطلاقات سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن اس معاملے کی جڑیں کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں اس کا واضح اندازہ اس مضمون میں نظر نہیں آتا تاہم یہ نظریہ ان کے اندر اپنی تفصیلات واضح کرتا رہا اور ان تحریروں کے علاوہ بھی، جو براہِ راست اس مسئلے پر لکھی گئی ہیں، سلیم احمد کے پورے کام کے پس منظر میں اس نظریے کی کارفرمائی بہت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے آدمی کی شکست کا جو نقشہ مرتب کیا ہے، اُسے دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوری تاریخ کو سمیٹ دیا ہے لیکن اس نظریے میں تاریخ کے علاوہ بہت کچھ ہے۔ عین ممکن ہے اس تصور کی ابتدائی شکل انسان اور آدمی کے اس فرق میں ہو جس پر عسکری صاحب بہت زور دیا کرتے تھے لیکن سلیم احمد کے ہاں پہنچ کر کسری انسان کے تصور میں اس کی شکل اور ہی بن گئی ہے۔ عسکری صاحب پر ہم ذرا ٹھیر کر گفتگو کریں گے۔ سلیم احمد کا سارا فکری منظر نامہ حقیقتِ انسانیہ کے گرد تشکیل پاتا ہے اور درجہ بندی کے تصور کے ذریعے ایک مظہریاتی حقیقت بنتا ہے۔ آدمی کی شخصیت میں شکست کا یہ عمل ان کے نزدیک ایک کائناتی اصول کی شکست ہے جس سے ایک طرف عدم توازن پیدا ہوا دوسری طرف انسان اجزا میں منحصر ہو کر رہ گئے۔ اجزا میں منحصر ہو جانا، فوق و تحت سے عاری ہو کر، افقی یا عمودی طور پر کسی ایک کیفیتِ وجود میں مقید ہو جانے کا نام ہے۔ یہ چیز بنیادی انسانی فطرت کے خلاف ایک طرح کی Solidification پیدا کرتی ہے۔ چونکہ کائنات میں انسان فعلیاتی حقیقت ہے اس لیے وہ تمام انسانی مظاہر جن کا اجرائے فعل اس کیفیت کے بعد کا ہے، وہ سب کے سب انسانی

ریزگی کا آئینہ بن گئے۔ حقیقتِ انسانی کے گم ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ حقیقتِ کائنات بھی گم ہو جائے۔ نفسیات کی دنیا میں بھی اجزا میں منحصر ہو جانے والی بات زیرِ بحث آئی ہے۔ مثلاً Jung کے ہاں Personae کے تصور سے بحث دیکھ لیجیے۔ شعری تنقید میں ایلیٹ نے جو بحث العدام شخصیت کے ضمن میں کی ہے اس کے ڈانڈے بھی کم و بیش اسی تصور سے جا ملتے ہیں اور بحث میں لارنس کا حوالہ تو خود سلیم احمد نے دیا ہے۔ یہاں ایک قابلِ غور بات یہ ہے کہ جس چیز کو ہم حقیقتِ انسانیہ کا مرعوب کن نام دے رہے ہیں، اس کے گم ہونے سے فرق کیا پڑتا ہے۔ کیا اس اکائی سے ہمیں ایک جذباتی محبت ہے۔ اس کے دو جواب ہیں، ایک تو مابعد الطبیعیاتی جو میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ہاں سے اپنے الفاظ میں نقل کر رہا ہوں اور دوسرا نفسیاتی۔ حضرتؒ نے فرمایا ہے کہ انسان مجموعہ ہے تمام مخلوقات کا، تمام اجزائے خلق اس میں مرتب ہوتے ہیں، لیکن مجموعہ ہونا بجائے خود کوئی شرف نہیں ہے۔ انسان میں اس کے علاوہ ایک اور شے ہے۔ یعنی اس کی ہیئتِ وحدانی۔ یہی ہیئتِ وحدانی اس کے شرف کا سبب ہے۔ اس سے معلوم یہ ہوا کہ انسان جب اجزا میں منحصر ہوتا ہے تو اپنے شرف سے ہاتھ دھو لیتا ہے اور اپنی ہیئتِ وحدانی سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ ہیئت تمام اجزا کو شامل بھی ہے اور سب سے منزہ بھی۔ اور اب یہ بات اپنی طرف سے تشریحاً کہتا ہوں کہ غالباً یہ ہیئتِ وحدانی ہی وہ عنصر ہے جس کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا، یا یہ کہ اس میں اپنی روح پھونکی۔ کسی ایک جز میں انحصار اس بے کیف و بے مثل عنصر سے محرومی کا باعث ہے جس پر حقیقتِ انسانیہ کا مدار ہے اور جو عالمِ خالق کی طرف سے ام کو جانے والا راستہ ہے۔ اس شے کی گمشدگی ایک انسانی نہیں بلکہ کائناتی المیہ ہے، اس لیے کہ کائنات کے تمام اجزا و عناصر کی معرفت کی تکمیل اسی ہیئتِ وحدانی کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس چیز کا اطلاق ادب اور دیگر مظاہرِ خیال پر بھی کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں اس تفصیل میں جانا مقصود نہیں ہے۔ اب آئیے نفسیاتی تعبیر کی طرف۔ انسان کو بحیثیتِ وجود ایک اصول کا تابع ہونا چاہیئے اور ذات کے کسی حصے کو اس اصول سے

باہر نہیں رہنا چاہیے۔ اگر کوئی حصہ اس اصول سے آزاد ہو جائے تو اس سے Neurosis کی کیفیات پیدا ہوں گی۔ لیکن یہ کب ممکن ہے۔ اسی صورت میں جب مرکزی اصول منزّہ ہو اور ذات کی ساری تہوں کو سمیٹ سکتا ہو۔ اگر کوئی اصول انسانی فطرت میں موجود کسی امکانیے کو مسترد کرتا ہے تو وہ منزّہ نہیں ہے بلکہ وہ فطرت میں ترمیم و تنسیخ کر کے اسے ایک خارجی دباؤ کے تحت لانا چاہتا ہے۔ یہیں سے "ضابطۂ حیات" کی اصطلاح پیدا ہوتی ہے۔ انسانی فطرت میں ترمیم و تنسیخ کرنے کی کوشش سخت خطرناک ہے، اس لیے کہ فطرتِ انسانی کے عناصر کائناتی فطرت سے متعلق ہیں لہٰذا کسی عنصر کو منہا کر دینا انسان اور حقیقتِ خالقیت کے درمیان ایک بُعد پیدا کر دینے کے مترادف ہے۔ یہاں اس ساری گفتگو سے مراد اس نظریے کی شرح و تفصیل نہیں۔ وہ سلیم احمد خود کر چکے ہیں اور میں اس پر مزید کیا اضافہ کر سکتا ہوں۔ یہ باتیں ضروری اس لیے تھیں کہ اس تصور کی محیط حیثیت کا پس منظر ذہن میں رہے اور یہ واضح ہو جائے کہ سلیم احمد جب اپنے اس نظریئے کا اطلاق کسی تہذیب، شاعر یا شخصیت پر کرتے ہیں تو ان کی گفتگو کو نفسیاتی تنقید کی ایک فرع سمجھنا پرلے سرے کی غلطی ہو گی۔ اس تصور کا صرف ایک پہلو نفسیاتی اصطلاحوں میں کلام کرتا ہے ورنہ اس کی سطحیں درجہ وار، تہذیب، تاریخ اور علوم و فنون سے گزرتی ہوئی اس مابعد الطبیعیاتی سطح تک جا پہنچتی ہیں جسے ہم نے انسان کی ہیئتِ وحدانی کے نام سے پہچانا ہے۔ سلیم احمد کا خیال یہ ہے کہ انسانی شخصیت کی مرکزی اکائی کی شکست نے انسان کو اس امر پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنی ذات کے کچھ پہلو چن کر ان کے ذریعے اپنی شناخت متعین کرے اور باقی پہلوؤں کو مسترد کر دے۔ اس طرح انسان جز در جز تقسیم ہوتا ہوا آج کی نفلزاتی صورتِ حال میں پہنچ گیا ہے۔ یہی حال شعری اور ادبی تاریخ کا بلکہ تسلسلِ تہذیب کا ہے۔ انسان کی وسیع اکائی رفتہ رفتہ گم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا جو اثر پڑتا ہے اس کی طرف تو اشارہ ہو چکا، انسانی شخصیت میں اس اکائی کی موجودگی کے تہذیبی اثرات کیا ہوتے ہیں اس پر ایرانی ماہرِ نفسیات، ایرخ فرام کے چہیتے شاگرد، رضا آراستہ کی بات سنیے۔ رضا آراستہ کا کہنا ہے کہ ادنیٰ سطح سے اعلیٰ ترین سطح

تک ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ شخصیت میں اکائی کی نوعیت سے وابستہ ہے۔ اعلیٰ ترین اکائی کے حصول کے بعد ان کے نزدیک انسان ایک بین التہذیبی شخصیت بن جاتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے Trans-cultural personality کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اُن کے نزدیک اس کی مثال رومی اور گوئٹے ہیں۔ رضا آراستہ نے بھی اپنے نظریے کی بنیاد اُنھیں عناصر پر رکھی ہے۔ جن سے سلیم احمد نے اپنے اساسی مقدمات ترتیب دیے ہیں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ۔ میں اس معاملے میں بولنے والا کون لیکن ذرا دونوں کو پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ آراستہ نے ایک تو اتنی بھیانک غلطیاں کی ہیں کہ آدمی پڑھ کر کانپ اٹھتا ہے۔ دوسرے منطقی ربط اور اصولی وسعت کے نقطۂ نظر سے بھی ان کا نظریہ سلیم احمد کے قائم کردہ اصول اور تجزیے کے سامنے بچوں کا کھیل ہے۔ مگر ان صاحب انگریزی میں ارشاد فرماتے ہیں، سلیم احمدؔ اردو کے ایک نیم خواندہ ادیب ہیں۔"

میں نے اس گفتگو میں بار بار نظریہ اور تصوّر کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ بڑی گمراہ کن حرکت ہے اور اس کا ازالہ چاہیے بلکہ بقول سلیم احمد ازالہ چونکہ ممکن نہیں ہوتا لہٰذا امالہ کیا جاتا ہے۔ انسان کی کسریت سلیم احمد کا نظریہ نہیں ہے، ان کا تجربہ ہے۔ یہ اُن کے لیے ایک وجودی حقیقت ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصّہ اسی کسریت سے لڑنے اور اکائی کی مختلف منزلوں کو طے کرنے کی کوشش میں گزرا ہے۔ اگر آپ اس جوکھم کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو میں آپ سے پوچھوں گا کیا آپ نے زنجیری ردِ عمل والا ایٹمی ری ایکٹر اندر سے دیکھا ہے؟

سلیم احمد کی شخصیت کے اتنے پہلو اور اتنی جہتیں ہیں کہ ان کے درمیان ایک مرکزی اصول دریافت کرنا پہلی نظر میں مشکل ہوتا ہے اور اگر آپ ایک مرتبہ وہ اُصول دریافت کرلیں تو پھیلے ہوئے دھبّوں اور غیر مربوط لکیروں کا یہ معمورہ ایک وسیع تصویر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ نقاد، شاعر، کالم نگار، ڈراما نگار، فلم رائٹر، مناظرہ باز، سیاسی تجزیہ نگار اور سب سے بڑھ کر اپنے کمرے میں احباب سے ہر شام گفتگو کرنے والا شخص اور احباب کے رخصت ہو جانے کے بعد صبح تک کمرے میں ٹہل ٹہل کر سگریٹ

پھونکتا ہوا سوچ کو زندگی بنانے کے عمل سے گزرنے والا بد قسمت آدمی ۔ اس ایک ذات میں سیکڑوں پہلو باہم دست و گریباں ہیں۔ سلیم احمد ان سب کو سمیٹ لینا چاہتے ہیں، کسی کو مسترد نہیں کرنا چاہتے اور ایسا کسی دیرینہ رقیق القلبی کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ یہ اُن کے نزدیک زندگی کی شرط ہے۔ اس میں معاش کی صورت برہم ہوتی ہے تو ہو، کہ پورا انسان معاشی انسان نہیں ہوتا، اعصاب جواب دیتے ہیں تو دے جائیں کہ آدمی اعصاب کے جال کا نام نہیں ہے، دوستوں اور ادیبوں سے تعلقات خراب ہوتے ہوں تو گوارا کہ یک سطحی تعلق سے اس کا نہ ہونا بہتر۔ زندہ رہنا ۔ کفِ پا سے سرِ شوریدہ تک، مکمل، منظم اور مربوط سلیم احمد کا مقصود ہے۔ یہ شخص پورے معاشرے کا فرضِ کفایہ ادا کرتا ہے اور مکمل زندگی اس کی مزدوری ہے۔ سلیم احمد کے بارے میں کچھ لکھنا مشکل یوں بھی ہوتا ہے کہ حقیقت نگاری بھی مبالغہ آمیزی معلوم ہوتی ہے۔ یہ طے کر لینے کے بعد کہ کسری آدمی کی صورت حال سلیم احمد کا نظریہ نہیں بلکہ ان کا حال ہے، ہم ان کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور جوڑ کر دیکھنے کے لیے ایک بہتر پوزیشن میں آگئے ہیں۔ شکستہ باطن آدمی کا تجزیہ آسان ہوتا ہے۔ ایک ایک چیز اٹھاتے جائیے، تجزیہ کرکے اس کی جگہ پر سجاتے جائیے، مربوط اور منظم شخصیت کے سلسلے میں مشکل یہ ہے کہ لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا۔ تو اب مسئلہ یہ درپیش ہے کہ آغاز کہاں سے کریں ۔ شاعری۔ کوئی شے مجھ میں مجھ سے بھی بڑی ہے!

میرؔ کے بارے میں ایک قول بہت مشہور ہے، ضرب المثل کی حد تک۔ پستش بغایت پست، بلندش بغایت بلند۔ افسوس کہ اس قدر معرکہ آرا فقرہ لکھ سکنے والے شخص سے لوگ ایسی بد ذوقی کی بات منسوب کرتے ہیں اور اس قول کے معنی یہ نکالتے ہیں کہ میرؔ کے گھٹیا شعر بہت گھٹیا ہیں اور اچھے بہت اچھے۔ حالانکہ اس فقرے کا مقصود یہ ہے کہ میرؔ کے ہاں زندگی کی پست ترین سطح بھی ملتی ہے اور بلند ترین بھی۔ اسے کہتے ہیں نگاہ کی وسعت۔ یہاں اس حوالے سے مقصود یہ نہیں کہ یہ فقرہ اٹھا کر سلیم احمد پر چپکا دوں۔ بس ایک اصول بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آدمی پست سطح پر ہی مقیم ہو جائے تو آدھا رہ جائے گا اور اگر بلند سطح کو اختیار کرکے

پستی کو مسترد کر دے جب بھی آدھا رہ جائے گا۔ یہ کسریت کی دو ابعاد ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ ان دونوں کو زندہ رکھے، باہم متحرک تعلق میں وابستہ رکھے اور ان کے ارتباط سے :

گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم
گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم

کی کیفیت میں رہے۔ اس اصول کے خلاف جانے کو روایتِ علمِ شعر میں ہوسنا کی کہتے تھے :

بر کفے جام شریعت ، بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند ، جام و سنداں باختن

یہ "باختن" ذرا مشکل کام ہے۔ سلیم احمد نے اسی کو اختیار کیا ہے چنانچہ صفدر میر کو تو خیر وہ پہلے ہی کب بھاتے تھے، نعیم صدیقی صاحب بھی اس امر سے پریشان ہیں کہ اس اللہ رسولؐ کا ذکر کرنے والے کا قلم بار بار فسق و فجور کی طرف کیوں بہک جاتا ہے۔ یہ شخص ہے کیا، نہ صافِ حقیقت نہ دردِ مجاز۔ زبانِ حال سے وہ بھی یہی کہتے ہیں۔

Fix in a formulated phrase

یہ تو ہوا معاملہ تقسیم بر بنائے مواد و موقف۔ اب آیئے ہیئت اور اسالیب والوں کی طرف۔ سلیم احمد کی عام شہرت تو ایک کلاسیکی نقطۂ نظر رکھنے والے غزل کے شیدائی کی ہے۔ لیکن ایک طرف تو ان کی طرز یہ غزلیں کلاسیکی ذوق رکھنے والوں کو نہیں بچتیں۔ وہ اسے غزل کے مزاج سے کوئی بہت بڑی Deviation سمجھتے ہیں۔ سلیم احمد کی اِن غزلوں میں کن کن اساتذہ کی آواز بولتی ہے، اس کی تفصیل بعد میں، یہاں صرف مقصود یہ بتانا ہے کہ سلیم احمد کی شاعری میں ساقی فاروقی کو کلاسیکیت کا سرطان دکھائی دیتا ہے اور وہ غلط نہیں کہتے۔ مگر معاملہ یہ ہے کہ کوسوں بڑھا ہوا ہے پیادہ سوار سے۔ اگر رومانویت کے نمونوں کو سامنے رکھیں تو جائز طور پر وہ بہت کم ہوں گے۔ روزمرّہ کی زندگی کے مقابلے میں خواب تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ اور یہ سرطانِ اعظم ہومر سے ڈانٹے سے ہوتا ہوا مغرب میں ایلیٹ اور پاؤنڈ تک اور مشرق میں کیا کیا گناؤں — ایک سلیم احمد کو شہید کرنے کے لیے دنیا کی تین چوتھائی شاعری پر خطِ تنسیخ پھیر دینا ذرا غیر ذمّہ دارانہ سی بات لگتی ہے۔ خیر۔ دوسری طرف

لوگوں کو اسی شاعری میں جدیدیت کا عفریت بھی دکھائی دیتا ہے۔ غزل اپنی جگہ، مگر قطعات پر آیئے تو وہاں آپ کو ایک الگ مزاج ملے گا۔ اور نظموں میں کوئی اور ہی چیز دکھائی دے گی۔ ان سب سے گزر آیئے تو۔ مشرق جو باہم در آویزاں اسالیب اور ہیئتوں کا ایک حیران کن معمورہ ہے۔ اس تنوّع کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں، وسعت یا تخلیقی غیر ذمّہ داری۔ اب یہاں میں دعویٰ کرتا چلوں کہ اس پوری شاعری کا ایک لفظ بھی ایک مربوط تناظر سے خارج نہیں ہے۔

سلیم احمد نے اپنے مجموعے کا نام "اکائی" رکھا ہے اور سچّی بات یہ ہے کہ ان کی پوری شاعری مختلف سطحوں پر اسی اکائی کی تلاش ہے۔ ایک بکھرتے ہوئے جہان میں یکجا رہنے کی کوشش جو کائناتی سطح کا عمل بن گئی ہے۔ اس پورے عمل میں المیہ ڈراموں جیسی کشمکش پائی جاتی ہے، ایک کونیاتی انتشار میں اپنی ہیئت وحدانی کو برقرار رکھنے کی کوشش، جب جسم، ذہن اور روح مختلف سمتوں کی طرف ایک مرکز گریز قوّت کے زیرِ اثر ٹوٹ کر بکھر رہے ہوں، اس میں اس سے لڑنا اور انھیں یکجا رکھنے کی کوشش کرنا تو ایک بہت بڑے ڈرامے کا ہی موضوع ہے۔

غزلوں میں اگر ہم سلیم احمد کا مزاج متعیّن کرنے کی کوشش کریں گے تو اس کی دو سطحیں ہوں گی۔ مواد اور موضوع کے اعتبار سے، اسلوب اور طرز کی جہت سے۔ مواد اور موضوع کے اعتبار سے سلیم احمد کی غزلیں زیادہ تر ایک ہی مرکزی رشتے میں پیوست دکھائی دیتی ہیں۔ فرد اور معاشرے کا تعلق۔ فطرت کی دنیا ان کے ہاں کم سے کم دکھائی دیتی ہے۔ نہ ان کے ہاں، کم کم بادو باراں ہے، کی کیفیت ملتی ہے اور نہ ہی صحراؤں کی وسعت اور پہاڑوں کی صلابت۔ یہ سلیم احمد کے شعری منظر نامے کی ایک خالی جہت ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ Proper study of mankind is man کے اصول کے اتنے راسخ العقیدہ مخالف کے ہاں ایک لمحہ بھی ایسا نہ ہو جب وہ انسانی مظہریات سے باہر نکل کر سوچ سکے۔ خیر تو ہم نے بنیادی بات یہ طے کی کہ سلیم احمد کے ہاں فرد اور معاشرے کا تعلق ایک اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اصول بھی درست نہیں ہے۔ اصل میں سلیم احمد کا شعری مسئلہ ہے۔ تعلق۔ فرد کا اپنے آپ سے، اپنے غیر سے، معاشرے سے، معاشرے کے ذریعے محبت میں، نفرت میں، بے نیازی میں۔ سلیم احمد کی غزلیہ شاعری انسانی تعلق اور اس کی نوعیت

متعیّن کرنے والی قوتوں کے رزمیے کا مطالعہ ہے۔ انسانی وجود کی عمودی جہت میں یہ تعلق جسم، ذہن، روح کی ترتیب میں الگ الگ بھی ظاہر ہوتا ہے اور ایک کلی وجودی تجربہ بھی بنتا دکھائی دیتا ہے۔ میں یہاں مثالیں پیش نہیں کروں گا۔ آپ کے کتب خانے میں بیاض یا اکائی ہوگی، اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اگر آپ یہ زحمت گوارا نہیں کرنا چاہتے تو براہ کرم مضمون کا مطالعہ یہاں سے ترک کر دیجیے۔ لیکن غزلوں میں محض تعلق کی Modalities کے بیان کے علاوہ ایک اور بہت اہم چیز ہے جسے یوں تو کم و بیش ہر شاعر نے پوچھا ہے لیکن سلیم احمد نے اسے ایک ایسے مسلسل استفسار کی شکل دی ہے کہ یہ سوال ان کے وجود کی بنیادی تفتیش بن گیا۔ فنکار کیا ہے؟ وہ اس معاشرے میں کیا کرتا ہے، یہ اپنے فنی جوازِ وجود کی ایک مسلسل تلاش ہے اور اردو میں ایک نادر مثال۔ یہ سوال اس لیے بہت اہم بن جاتا ہے کہ فنکار انسانی تعلق کی بنیاد پر Operate کرتا ہے اور ان کی جزوی صورتوں کو جوڑ جوڑ کر ان کے اندر ایک منزّہ اکائی تلاش کرتا ہے۔ جب سلیم احمد نے شاعری شروع کی اس وقت فنکار معاشرے میں اجنبی بن چکا تھا۔ یہ ایک عالمی المیے کا حصّہ ہے۔ کولن ولسن کی Outsider اس کا بہت اچھا مطالعہ ہے۔ وجودیوں کے ہاں تو خیر اس کی بہت سی پرتیں کھلیں۔ خیر یہ صرف ایک فکری Contact کا معاملہ ہے سلیم احمد کے ہاں اس تجربے کا آغاز "صحرا میں اذان دے رہا ہوں" سے ہوتا ہے۔ جیسے جیسے آگے بڑھتے جائیں یہ پہلو بہت نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں کا تازہ ترین سلسلہ تو کم و بیش پورے کا پورا اسی مسئلے سے متعلق ہے سلیم احمد نے معاشرے سے اپنے تعلق کو متعیّن کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ سے بھی اپنا تعلق Define کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی معاشرتی جہت میں اب یہ احساس بہت نمایاں نظر آتا ہے کہ معاشرہ بحیثیت مجموعی فن سے بے نیاز ہو چکا ہے:

محلّے والے میرے کارِ بے مصرف پہ ہنستے ہیں
میں بچوں کے لیے گلیوں میں غبارے بناتا ہوں

لیکن ایک جہت سے یہ کامِ کارِ بے مصرف بھی نہیں ہے:

غنیمِ وقت کے حملے کا مجھ کو خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کے لشکر بناتا ہوں

اس کے علاوہ وہ غزل جس کی ردیف "تیز ہوا کے شور میں" ہے۔ اپنی جگہ ایک پورے تعلق کی نوعیت کو بیان کرتی ہے۔ اس میں ایک پہلو جو بہت سے شاعروں سے الگ ہے، وہ اس کی بہت مضبوط فلسفیانہ اساس ہے جو ایک مربوط تجربے سے پھوٹتی ہے اور ایک بہت بڑے تجربے کی شکل میں ہی ظاہر ہوتی ہے۔ فن اور معاشرے کا تعلق مابعد الطبیعیاتی سطح سے لے کر عام معاشرتی سطح تک ظاہر ہوتا ہے اور کسی طرح کی خود رحمی یا تعلّی سے پاک ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا سلیم احمد کی شاعری کا خمیر ایک تجزیاتی فراست سے اٹھتا ہے۔ جسے معکوس کر دیں تو فکر کی شکل پیدا ہوتی ہے۔ اس سے سلیم احمد نے خود جگہ جگہ بحث کی ہے خصوصاً "غالب کون" کے بعض ابواب میں فکر کو انھوں نے تجربات کو جوڑ جوڑ کر دیکھنے کا نام دیا ہے لیکن سلیم احمد کے ہاں تجربے کو جوڑنے کا رجحان بہت کم ملتا ہے، بلکہ اس کی پرتیں الگ کر کر کے دیکھنے کا طریقہ وہ زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی لیے ان کی شاعری جذبے کی بہت سی سطحوں کو محیط ہوتے ہوئے بھی ایک گھلاوٹ اور رچاؤ کا احساس کم رکھتی ہے۔ جو لوگ شاعری کو رچاؤ میں منحصر سمجھتے ہیں، ان کے لیے یہ بڑی پریشانی کی بات ہوگی۔ انسانی تجربے کی کیفیات دو ہیں اور شاعری دونوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ تجربہ انسان کی ذات میں گہرائی تک اترتا جائے۔ اس سے شاعری میں رچاؤ پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تجربے کے تجزیے سے پیدا ہونے والی قوت ایک مرکز گریز حرکت اختیار کر کے پوری طاقت سے ظاہر ہو، اس سے توانائی پیدا ہوتی ہے۔ سلیم احمد کی پوری شاعری انھیں دو قوتوں کو یکجا کر دینے کا ایک مسلسل رزمیہ ہے جس میں وہ ابھی تک کامیاب نہیں ہیں۔ "میں تیرے جسم کو دیکھوں تو نیند آنے لگے" اس میں اور "میری زبانِ آتشیں لو تھی مرے چراغ کی" میں فرسنگوں کا فاصلہ ہے۔ کہیں کہیں یہ آوازیں ایک دوسرے کے قریب آ جاتی ہیں لیکن پوری طرح مل نہیں پاتیں اور اسی کش مکش کے نقطے پر سلیم احمد کا اہم ترین سوال پیدا ہوتا ہے۔ انسانی ذات سے معاشرے تک گریزاں

قوتوں کے درمیان فنکار کا منصب کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ سلیم احمد ان دو آوازوں کو جوڑنے میں ہمیشہ ناکام رہیں۔ ان کی شخصیت کا اصول اکائی کا حصول نہیں، اس کی تلاش ہے اور یہ تو درست ہے کہ بعض اوقات بہت بڑے فنی نمونے فنکار کی داخلی ناکامیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ تمام عمر ہیں ناکامیوں سے کام لیا سلیم احمد کا یہ سارا مسئلہ ہمارے ہاں ڈرامے کی کمزور روایت کی بنیاد پر شاعری میں بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا پس منظر ہے۔ جدید اردو ادب کے باطن میں ایک کائناتی آویزش ہے جو بہت ڈرامائی اظہار چاہتی ہے۔ اس کشمکش کا تجربہ پہلے کی شاعری میں کہیں موجود نہیں۔ ڈراما اُس معاشرے میں پیدا ہی نہیں ہوتا جہاں چیزیں درجہ دار مابعدالطبیعیاتی منطق میں گتھی ہوئی ہوں۔ اس لیے کہ ہر تضاد کا اس سے اوپر کی سطح پر حل موجود ہے۔ جب یہ کائناتی آویزش پیدا ہوئی تو ہم نے اپنا سب سے بڑا ڈراما نگار بھی پیدا کیا ــ اقبال۔ اگر یہ روایت آگے بڑھی ہوتی تو معاملات کی نوعیت اور ہوتی۔ بہرکیف فی الحال ہم سلیم احمد کے شعری مواد سے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ ان کی غزل اردو کی موجودہ شاعری میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن یہ سلیم احمد کی پوری ذات کو سمیٹ نہیں سکتی۔ سلیم احمد بنیادی طور پر مرکب صنف کے آدمی ہیں۔ غزل میں بھی وہ وہاں بہت کامیاب ہوتے ہیں جب شعر کو مکالمے کی چستی کے ساتھ موزوں کرتے ہیں۔ چنانچہ لہجے کی جتنی Variations سلیم احمد کے ہاں ہیں وہ جدید اردو ادب میں کسی شاعر کو نصیب نہیں ہیں۔ معاشرہ، فرد اور فنکار ایک مابعدالطبیعیاتی پس منظر میں ایک بڑی آویزش کا شکار ہیں اور سلیم احمد نے اس کے لیے ایک مرکب صنف خود ایجاد کی۔ ادب میں کسی صنف کا موجد بہت بدقسمت آدمی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس ایجاد کو آپ ان معنوں میں نہ سمجھیے گا جن معنوں میں لوگ نثری نظم وغیرہ ایجاد کرتے ہیں۔ "مشرق" میرے نزدیک سلیم احمد کا ایک بہت ہی بڑا کارنامہ ہے۔ پوری نظم میری نظر سے نہیں گزری لیکن اس کے بہت سے حصّے میں نے سنے ہیں۔ اپنی کلیت کو گرفت میں لینے کی یہ ایک غیر معمولی اور بہت سفّاک کوشش ہے۔ اگر مجھ سے اردو کی پانچ

اہم ترین نظموں کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تو تین اقبال کی، ایک مسدس حالی اور پانچویں "مشرق" انتخاب کروں گا۔ اب ہماری گفتگو خود بخود طرز اور اسالیب کی طرف آگئی ہے۔ مواد کے بارے میں مزید تفصیل یہاں بیان کرنی مقصود نہیں وہ ایک الگ مضمون کا موضوع ہے۔

سلیم احمد کے ہاں غزل میں اسالیب کا تنوع اور چیز ہے، نظم میں بالکل اور چیز، لہٰذا ہمیں ایک سطح پر ان دونوں چیزوں کو الگ الگ کر کے دیکھنا ہوگا۔ "بیاض" کے دیباچے میں سلیم احمد نے ایک بات کہی تھی کہ میں شاعری کو شعور کی اولاد سمجھتا ہوں۔ یہ ان کے شعری تجربے کو سمجھنے کے لیے ایک کلیدی فقرہ ہے اس کے معنی یہ ہوتے کہ شعری عمل، اس کے عناصر پر زور اور اس کی تہذیبی شناخت سلیم احمد کے ہاں ذات کے اندر کسی پُراسرار کیمیا کا نام نہیں ہیں بلکہ وہ ان کے اس بنیادی تصور سے پھوٹتے ہیں جو ان کے ذہن میں ایک تجزیاتی وضاحت کے ساتھ راسخ ہے۔ یہاں اگر وہ ایک جہت میں روایتی شعری طریقۂ کار سے منسلک ہوتے ہیں اور دوسری جہت میں علیحدہ۔ منسلک اس طور کہ روایت میں بھی شاعری علائم و رموز کے شعوری انجذاب کا نام ہے۔ اور انفرادی رویہ ہائے شعر کی عمارت علوم شعریہ کے ایک بہت وسیع نظام پر استوار ہوتی ہے۔ الگ اس انداز میں ہیں کہ ان کا شعور روایتی شعور سے الگ ہے۔ یعنی اس میں وہ کشمکش، وہ آویزش اور وہ سوال پائے جاتے ہیں جو روایتی شعورِ تہذیب میں موجود نہیں تھے۔ وہاں انفرادی اور تہذیبی شعور میں جذب و انجذاب کا رشتہ ہے اور یہاں گریز کا جب اس گریز کو جذب میں بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس سے وہ کش مکش پیدا ہوتی ہے جو شعری شرر کو جنم دیتی ہے۔ سلیم احمد اپنی شخصیت میں موجود اس جنگ کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اس وقت اردو شاعری میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کے ہاں یہ عمل اتنے وسیع پیمانے پر اتنی شدت سے جاری ہو۔ اسی سے سلیم احمد کے متنوع اسالیب شعر پیدا ہوتے ہیں۔ روایت ان کے لیے ایک بسیط وحدانی حقیقت بھی ہے اور انفرادی پہلوؤں کا مجموعہ بھی۔ اگر وہ روایت کے بسیط پہلو کو قبول کر لیں تو یہ مسئلے کا ایک مجرّد حل ہوگا لہٰذا پھر وہ اس

کے اندر موجود متنوّع اسالیب کی طرف جاتے ہیں۔ یہ اسالیب، طنز کے ہیں، بیان جمال کے ہیں، غصّے کے ہیں، اظہار محبت کے ہیں، غرضیکہ انسانی شخصیت کی کلیّت ترتیب دیتے ہیں۔ ان معنوں میں سلیم احمد اسالیبِ شعر کے مسافر ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ انسانی نفس کی متنوّع کیفیات کو متعیّن استعاروں اور اسالیب میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ یہ گویا Infinity کو Finite میں گرفت کرنے کی کوشش ہے۔ اس سارے کام میں سلیم احمد کے ارد گرد کے شعری مزاج نے اُن کی کوئی مدد نہیں کی اس لیے کہ اس کے سامنے وہ سوال ہی نہیں تھے جو سلیم احمد کے سوال ہیں۔ کہیں کہیں ہمیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مل جاتے ہیں۔ مثلاً کچھ معاملہ فراق کا ہے، کچھ یگانہ کا، تھوڑا بہت سلیم احمد نے حسرت سے سیکھا ہے۔ اقبال کا ذکر میں یہاں رہنے دیتا ہوں اس لیے کہ وہ معاملہ تفصیلی بحث کا متقاضی ہے اور آگے آئے گا۔ اپنی کلیّت، جس کے معنی ہیں تہذیبی واردات کی کلی دریافت و شناخت، کے بیان کے لیے سلیم احمد کو سب سے پہلے ایک چیز سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

اردو کے ادبی مزاج نے ایک تقسیم شعری اور غیر شعری عناصر کی کر رکھی تھی۔ بعض دھندلے امیجز اور مخصوص خیالات شعری سمجھے جاتے تھے اور عام زندگی کے اسالیب غیر شعری قرار پاتے تھے۔ یہ قطعیت حسبِ معمول ایک جدلیات میں ڈھلی۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو تغزّل کا ایک محدود تصوّر رکھتے تھے اور دوسری طرف وہ جو صرف ان عناصر سے شاعری پیدا کرنا چاہتے تھے جو تغزّل والوں نے مسترد کر دیے تھے۔ سلیم احمد کا معاملہ یہ ہے کہ اسالیب و علائم میں تو ان کے ہاں شعری روایت کا تصوّر موجود ہے لیکن مواد میں نہیں۔ چنانچہ سلیم احمد نے ان دونوں گریزاں عناصر کو اپنی ذات میں جمع کیا۔ اِس سے اُن کے ہاں ایک الگ انداز کا لہجہ اور ایک خاص طرح کی "وِٹ" پیدا ہوئی جس کے نشانات ہمیں غالب اور بہت حد تک میر کے ہاں ملتے ہیں۔ سلیم احمد کے ہاں یہ عمل شعری فضا کے ردِّ عمل میں نہیں بلکہ اپنے داخلی تصورِ روایت اور جدید دنیا میں اس کی آویزش سے پیدا ہونے والے سوالوں سے پھوٹتا ہے، اس لیے اس کے تنوّع میں ایک بہت بڑی داخلی وحدت پائی جاتی

ہے۔ نظم میں صورتِ حال یہ ہے کہ سلیم احمد نے ان عناصر کو پہلو بہ پہلو رکھ کے ایک کائنات تشکیل دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظم اپنے تاثر میں شدید ہے لیکن اپنے ادبی Context کی طرف سے فرض کفایہ تو اُنھوں نے غزل میں ہی ادا کیا ہے۔ "مشرق" مجھے ایک طویل نظم سے کہیں زیادہ جوائس کے نیم منظوم ناول کی طرح کی چیز لگتی ہے۔ غزل میں اس پوری صورتِ حال کا ست کھنچ آیا ہے۔ اور اس عمل میں سلیم احمد کو جس جوکھم سے گزرنا پڑا ہے اس کا اندازہ اُس وقت ہی ہو سکتا ہے جب آدمی اپنی ذات کے ریشے ریشے کو الگ کر کے دیکھنے کی ہمت رکھتا ہو کہ یہ کن کن نیستانوں سے آتے ہیں اور کس اصول پر مربوط ہیں۔

اُردو میں آج کل خصوصاً کسی شاعر سے آپ اس کے قاری کے ردِّ عمل کا ذکر کریں تو اس سے فوراً ایک Snobbery کا اظہار ہوگا۔ وہ ایک کائناتی بے نیازی کے ساتھ آپ کو بتائے گا کہ اسے اپنے قاری کی کوئی پروا نہیں ہے، وہ تو ایک تجربے کی گرفت میں ہے۔ اکثر اوقات یہ ایک بے جا تکبّر اور صریح جھوٹ کی پیداوار ہوتا ہے۔ قاری سلیم احمد کا مسئلہ ہے، اس لیے کہ سلیم احمد کے پاس قاری موجود ہیں۔ لیکن یہ اس صورت میں نہیں کہ وہ اس کی ذہنی ساخت کے مطابق اپنے تجربے میں ترمیم کریں۔ وہ اُسے ناراض کر سکتے ہیں، اُسے چھیڑ سکتے ہیں، اُس سے محبت کر سکتے ہیں، اُس سے نفرت کا اظہار کر سکتے ہیں لیکن اُس سے قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ شاعری کا مقصود ہم کلام رہنا ہے۔ صرف اپنی ذات سے ہم کلامی ایک خوش نما رومانی جھوٹ ہے۔ یہ ہوتی ہے لیکن اس کا وجود فی الخارج ہونا چاہیے۔ شاعر کی خود کلامی ہملٹ کی طرح ناظرین یا تمکین کے سامنے واقع ہوتی ہے اسٹیج کے پردے کے پیچھے نہیں۔ خیر تو سلیم احمد اس ہم کلامی کو قائم رکھنا چاہتے ہیں لیکن ان کے قاری دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو ادب کی دنیا میں موجود ہیں اور سلیم احمد کی ذات میں موجود جدل کو سمجھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو بنیادی طور پر مصنّفین کرام نہیں بلکہ ادب کے قاری ہیں۔ وہ ادب اپنی داخلی ضرورت سے پڑھتے ہیں۔ ان دونوں کے ردِّ عمل مختلف

ہیں مصنفین کرام میں اکثر کا ردِ عمل یونانی ڈرامے کے ناظرین کا ہے۔ ان میں ارسطو کے اصول کے مطابق خوف اور رحم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ سلیم احمد کے اندر جو تہذیبی جنگ موجود ہے اس سے اُن میں خوف پیدا ہوتا ہے۔ اُن کے اعصاب اُس کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ پھر اُنھیں اپنے قبیلے کا ایک فردِ جان کر وہ رحم کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ میری یہ Analogy مکمل ہے۔ اس کی مزید تفصیل بوطیقا میں دیکھ لیجیے۔ غیر مصنف قاری کا معاملہ ذرا احسانمندی کا ہوتا ہے۔ مسئلہ اس کے اندر موجود ہے لیکن وہ اپنے مسئلے کو اس طرح Live نہیں کر سکتا، چنانچہ سلیم احمد کو پڑھتا ہے۔ سلیم احمد یہاں بھی دونوں کو ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں۔ اپنی تحریر کے بے پناہ تاثر میں۔

سلیم احمد کی شعری تربیت ایک ایسے شخص نے کی جو خود مصرع موزوں نہیں کر سکتا تھا۔ محمد حسن عسکری۔ عسکری کا شعری مطالعہ اور تہذیبی judgement ضرب المثل کی ذیل میں داخل ہے۔ لیکن محمد حسن عسکری کی نگاہ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار کی تھی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان کی نظر تجربے کے نتائج سے زیادہ اس کی نوعیتِ وقوع پر ہوتی تھی۔ یہ وہ نادر لمس تھا جو سلیم احمد کی شاعری کو نصیب ہوا۔ سلیم احمد خود کو عسکری کا شاگرد کہتے ہیں اور اُنھوں نے کوئی چالیس برس عسکری کی شاگردی میں گزار دیے لیکن اگر ہم اسے مروّجہ معنوں میں سمجھیں تو ہم ایک ہولناک غلطی کے مرتکب ہوں گے۔ عسکری اور سلیم احمد کی اُستادی شاگردی کا معاملہ کچھ افلاطون اور ارسطو والا ہے۔ یہ نہ سمجھیے گا کہ افلاطون و ارسطو کو عسکری اور سلیم احمد سے بھڑا رہا ہوں، تعلق کی نوعیت کو سمجھنا مقصود ہے۔ سلیم احمد اور محمد حسن عسکری کے مزاج میں قطبین کا فرق ہے۔ یہ دونوں ہر چیز میں اُلٹ ہیں اور اسی لیے ان کا تعلق Complementary ہے۔ سلیم احمد نے عسکری کو کس کس طرح متاثر کیا، یہ ایک الگ مضمون کا موضوع ہے لیکن وہ چیز جسے عسکری کا مکتبِ فکر کہا جاتا ہے، وہ ان دونوں سے مل کر ہی ترتیب پاتا ہے۔ یہ ایک مشترک Praxis ہے۔ عسکری

کی نظر ادبیاتِ عالم پر وسیع تھی۔ یہ ایک دوربینی نگاہ تھی کہ جس کے سامنے زمینوں اور زمانوں کے ادب اور فلسفے پھیلتے چلے جاتے تھے۔ یہ رزمیے کا طریقۂ کار ہے۔ سلیم احمد کی نگاہ خُردبینی ہے۔ اُنھیں ایک شعر دے دیجیے وہ اس کی پرتیں اتارتے، اُس کے تانے بانے ادھیڑتے اور اُس کا تجزیہ کرتے کرتے اُس کی باطنی وحدت تک پہنچ جائیں گے۔ یہ ڈرامے کا تجزیاتی طریقۂ کار ہے۔ چالیس برس کا گہرا تعلق ایسا نہیں ہوتا کہ اسے یوں چار سطروں میں نمٹا دوں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ سلیم احمد اور عسکری کے تعلق کو ایک جامد استادی شاگردی کا تعلق نہ سمجھ لیا جائے۔ سلیم احمد کے دعوے کے باوجود۔ عسکری کی وفات پر سلیم احمد نے کہا کہ میں عسکری کا آدھا شاگرد ہوں، میں تو خود کو اُن کا شاگرد کہتا تھا، وہ نہیں مانتے تھے۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ یعنی آدھا شاگرد ہونے والی بات۔ سلیم احمد کی شخصیت کا ایک حصہ عسکری صاحب کے اثر سے باہر اپنے الگ اصولِ نمو کے مطابق پھلا پھولا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جہاں سے سوال پیدا ہوتے تھے اور عسکری کی سمتِ سفر متعین کرتے تھے۔ حضرت علیؑ کا قول ہے کہ سوال آدھا علم ہے۔ روایت، تہذیب اور جدیدیت کے بارے میں سلیم احمد کے تصورات اپنے داخلی اسٹرکچر میں عسکری صاحب کے نتائج سے بہت حد تک مختلف ہیں، ان پر ہم کبھی اور گفتگو کریں گے۔ سلیم احمد کا معاملہ یہ ہے کہ شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا۔ وہ عسکری صاحب کا اثر ایک حد سے زیادہ قبول نہیں کر سکتے تھے اور اس اثر کو بھی وہ اپنے تجربے اور اپنی کلیت میں رکھ کر بالکل منقلب کر دیتے ہیں۔ ان کے ذہن میں بنیادی Figure اقبال کی ہے یہ ان کا substance ہے۔ سلیم احمد کی شخصیت میں اقبال اور عسکری کا اثر ان کے زائچے میں قرانِ شمس و زحل کی طرح ہے۔ ایک سب آگ ایک سب پانی! سلیم احمد کا بنیادی شعری مزاج فراق کا ہے ہی نہیں وہ اقبال کا ہے، وہی جذب و شوق وہی سرمستی۔ دوسری طرف عسکری صاحب کی مناسبت مجردات سے کہیں زیادہ ہے۔ ان دونوں عناصر کی کشمکش نے سلیم احمد کی شخصیت میں ایک عجیب و غریب برقی چارج

پیدا کر دیا ہے ابھی تک یہ عناصر یکجا نہیں ہو سکے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں لیکن ان کا پہلو بہ پہلو موجود رہنا ایک بہت بڑا تہذیبی واقعہ ہے۔ یہ فرضِ کفایہ سلیم احمد ہی ادا کر سکتے ہیں اس لیے کہ معمولی اعصاب کا آدمی تو اس کششِ قطبین کے درمیان دو دنوں میں خون تھوک جائے گا۔

سلیم احمد کی شاعری اور اس کی نوعیتِ ترکیب کی طرف ان ضروری اشاروں کے بعد آیئے ہم پھر ان کی تنقید کی طرف لوٹیں۔ شخصیات پر سلیم احمد نے تین کتابیں لکھی ہیں "غالب کون"، "اقبال ایک شاعر" اور "محمد حسن عسکری۔ انسان یا آدمی"۔ یہ تین کتابیں سلیم احمد کے سوانحی ناول کے ابواب ہیں۔ وہ میرؔ کے بڑے قائل ہیں، لیکن کتاب درکنار مضمون ان سے نہیں لکھا جاتا۔ کیوں؟ فراقؔ کے عاشق ہیں مضامین میں حوالے آتے ہیں لیکن تفصیل سے نہیں لکھ سکتے۔ جوشؔ پر تین مضمون (جو جوشؔ پر اردو میں سب سے اچھے مضامین ہیں) اس اعلان کے ساتھ لکھے کہ کتاب ہوگی، لیکن نہ لکھ سکے۔ کیوں؟ اصل میں جس آدمی کا مسئلہ حل ہو گیا ہو، جو غلط یا صحیح کسی مؤقف میں Crystallise ہو گیا ہو جس کی روح میں جنگ کسی مثبت یا منفی انجام کو پہنچ چکی ہو وہ سلیم احمد کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس سے ان کی دلچسپی حسرت کی ہو سکتی ہے، عبرت کی ہو سکتی ہے لیکن وہ ان کی ذات کا اصولِ حرکت نہیں بن سکتا۔ یہ بات سب کے بارے میں درست ہے حتیٰ کہ میرؔ کے بارے میں بھی۔ وہ میرؔ کے توازن کو حسرت سے دیکھتے ہیں لیکن اپنے مسئلے کا عکس انھیں غالبؔ میں ہی نظر آتا ہے۔ وہ تمام مفکرین اور صوفیہ کو پڑھ سکتے ہیں لیکن اپنی آواز انھیں اقبالؔ کے ہاں ہی سنائی دیتی ہے لارنس اور آسپنسکی اُن کے ہاں ہر سطر میں آتے ہیں، مگر چالیس برس کا تعلق عسکری سے ہی رہ سکتا ہے۔ تکمیل سلیم احمد کا خواب بھی ہے اور خوف بھی۔ یہ ان کے بارے میں بنیادی بات ہے۔

سلیم احمد کی ہر کتاب پر تنازعہ بپا ہوتا ہے اس لیے کہ اُن کی ہر تحریر بڑی شخصیت کے گرد نمو پانے والے تصورات کے جنگل کو کاٹ کر ایک نیا راستہ بناتی ہے۔ "غالب

کون" کے سلسلے میں یہی ہوا اور "اقبال ایک شاعر" کے سلسلے میں یہی صورت پیش آئی۔ ان دونوں کتابوں میں سلیم احمد کا طریقۂ کار نفسیاتی ہے یعنی شاعری کو شاعر کے Inner structure کے طور پر قبول کر کے اُس سے اُس کی ذات کی تہوں کو ترتیب دینا۔ خدارا اسے موجودہ نفسیاتی طریقۂ تنقید کے ساتھ مخلوط نہ کریں جو نفسیاتی صرف اس حد تک ہوتی ہے کہ اس میں کچھ مشہور اور کچھ غریب الانام ماہرین نفسیات کے نام آ جاتے ہیں۔ سلیم احمد نے نفسیاتی طریقۂ تنقید کو ایک ایسا طریقہ بنا دیا ہے۔ جس میں ہم شاعر کے ساتھ اس کے تجربے کی تہوں سے گزرتے ہیں اور ہر سطح کو ایک وسیع علمی پس منظر میں Formulate کرتے جاتے ہیں۔ اس طریقے کو "اقبال ایک شاعر" میں سلیم احمد نے جس کامیابی کے ساتھ برتا ہے وہ بے مثال ہے، البتہ یہ اُن کی سب سے زیادہ misunderstood کتاب ہے۔ محمد حسن عسکری پر ان کی کتاب تصورات کو بہت وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہے اور فی الحال اس کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اپنی جگہ ایک اہم کتاب ہے لیکن اس کی خامی یہ ہے کہ عسکری کے نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ تجربہ نہیں جس کے ذریعے وہ اِن نتائج تک پہنچے۔ اس کتاب کو سلیم احمد کی شاعری کا دیباچہ جاننا چاہیے۔

سلیم احمد کی ذات کے مختلف پہلوؤں کے الگ الگ تجزیے کو میں کسی اور وقت پر اُٹھا رکھتا ہوں۔ اس مضمون کا مقصود یہ تھا کہ اُن کی شخصیت کا بنیادی اصول پوری طرح سمجھ میں آ جائے۔ اب اوراق پلٹ کر پڑھتا ہوں تو یہ بات بھی مکمل نہیں ہو سکی۔ کالم، ڈراما، فلم، مذہبیات، کتنے دائرے ہیں جن پر گفتگو نہیں ہوئی اور یہ لکھنے والے کی ناکامی ہے۔ لیکن اگر میں سلیم احمد کی پوری شخصیت کو ایک مضمون میں بیان کر لیتا تو میرے لیے یہ بڑی افسوسناک بات ہوتی اور سلیم احمد کے سلسلے میں بھی یکساں طور پر۔ تنقید اگر کامیاب ہو جائے تو جس پر لکھی گئی وہ ناکام آدمی ہے۔ اُس کے تجربات اتنے ہیں کہ آپ ایک مٹھی بھر لیں تو اس کی زنبیل خالی ہو جائے۔ میرے لیے سلیم احمد ایک تنقیدی مضمون کا موضوع نہیں بلکہ ایک گہرا تجربہ ہیں۔ میں بار بار اس تجربے کی طرف

پلٹتا ہوں اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لارنس نے کہا ہے کہ ہر آدمی کی ذات میں ایک تاریک برِاعظم ہوتا ہے جس میں سے اُسے بہت سی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ سلیم احمد کی تحریریں میرے لیے ایسا ہی تاریک برِاعظم ہیں۔ اُن میں نہ جانے کیا کچھ ہے، کتنے اعصاب شکن تجربے ہیں، کس قدر مطالعہ ہے، تہذیبوں کا کتنا بڑا تقابلی جائزہ ہے اور سب سے بڑھ کر انسانی نفسیات کا کتنا غیر معمولی اِدراک ہے۔ ان سب چیزوں کا ایک مبہم نقشہ میرے ذہن میں بنتا ہے لیکن ابھی یہ ساری باتیں مجھ پر پوری طرح واضح نہیں ہوئیں۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ شخص مجھ جیسے بچوں کے لیے گلیوں میں غبارے بناتا ہے اور یہ ایک بہت قیمتی آدمی ہے۔ بہت زندہ۔ بہت خوفناک حد تک زندہ آدمی جو اُن سوالوں سے نبرد آزما ہے، جن سے تہذیبیں نبرد آزما ہوتی تھیں۔ میرے لیے یہ بوجھ کون اُٹھا سکتا ہے ؟

چراغِ نیم شب



وہ ابتداؤں کی اِبتدا ہے، وہ اِنتہاؤں کی اِنتہا ہے
ثنا کرے اس کی کوئی کیوں کر، بشر ہے لیکن خدا نما ہے

وہ کون ہے منتظر تھا جس کا جہانِ نورانیاں ازل سے
گواہ ہے کہکشاں ابھی تک کہ کوئی اس راہ سے گیا ہے

وہ سِرِّ تخلیق ہے مجسّم کہ خود ہی آدمؑ ہے خود ہی عالم
وجود کی ساری وسعتوں پر محیط ہے جو وہ دائرہ ہے

وہی ہے اوّل وہی ہے آخر، وہی ہے باطن وہی ہے ظاہر
یہ سوچ ہے آگہی سے باہر، وہ اور کیا ہے، جو رہ گیا ہے

اُنھی کا مسکن اُنھی کا گھر ہیں، اُنھی کی نسبت سے معتبر ہیں
حرم ہو، طیبہ ہو، میرا دل ہو، یہ سب وہی ایک سلسلہ ہے

نہیں ہے کوئی مثیل اُس کا، نہیں ہے کوئی نظیر اُس کا
وہ شخص بھی ہے، وہ عکس بھی ہے، اور آپ اپنا ہی آئنہ ہے

ہے حدِّ فاصل کہ خطِّ واصل کہ قوس کے قوس ہے مقابل
سلیمؔ عاجز ہے فہمِ کامل کہاں بشر ہے کہاں خدا ہے



شوقِ بے حد، غمِ دل، دیدۂ تر مل جائے
مجھ کو طیبہ کے لیے رختِ سفر مل جائے

نامِ احمدؐ کا اثر دیکھ جب آئے لب پر
چشمِ بے مایہ کو آنسو کا گہر مل جائے

چشمِ خیرہ نگراں ہے رُخِ آقاؐ کی طرف
جیسے خورشید سے ذرّے کی نظر مل جائے

یادِ طیبہ کی گھنی چھاؤں ہے سر پر میرے
جیسے تپتی ہوئی راہوں میں شجر مل جائے

نخلِ صحرا کی طرح خشک ہوں، وہ ابرِ کرم
مجھ پہ برسے تو مجھے برگ و ثمر مل جائے



مجھے اِن آتے جاتے موسموں سے ڈر نہیں لگتا
نئے اور پُر اذیّت منظروں سے ڈر نہیں لگتا

خموشی کے ہیں آنگن اور سنّاٹے کی دیواریں
یہ کیسے لوگ ہیں جن کو گھروں سے ڈر نہیں لگتا

مجھے اس کاغذی کشتی پہ اک اندھا بھروسا ہے
کہ طوفاں میں بھی گہرے پانیوں سے ڈر نہیں لگتا

سمندر چیختا رہتا ہے پس منظر میں اور مجھ کو
اندھیرے میں اکیلے ساحلوں سے ڈر نہیں لگتا

یہ کیسے لوگ ہیں صدیوں کی ویرانی میں رہتے ہیں
انھیں کمروں کی بوسیدہ چھتوں سے ڈر نہیں لگتا

مجھے کچھ ایسی آنکھیں چاہئیں اپنے رفیقوں میں
جنھیں بیباک سچّے آئنوں سے ڈر نہیں لگتا

مرے پیچھے کہاں آئے ہو نا معلوم کی دُھن میں
تمھیں کیا اِن اندھیرے راستوں سے ڈر نہیں لگتا

یہ ممکن ہے وہ اُن کو موت کی سرحد پہ لے جائیں
پرندوں کو مگر اپنے پروں سے ڈر نہیں لگتا



اب ڈوب گئی ہیں وہ صدائیں
لوگوں سے کہو کہ لَوٹ جائیں

بارش سے چھتیں ٹپک رہی ہیں
چڑیاں کہاں گھونسلے بنائیں

یہ راہ طلسم عشق کی ہے
ملتی ہیں بڑی بڑی بلائیں

آنچل میں چراغ جل رہے ہیں
بچوں کو بلا رہی ہیں مائیں

ساماں تو یہی ہے عافیت کا
اَب آوٗ یہ کشتیاں جلائیں

ہونٹوں پہ دھویں کی تہ جمی ہے
سینے میں سُلگ اُٹھیں دعائیں

وہ شہر تو چُھٹ چکا ہے کب کا
اس عمر کو اب کہاں گنوائیں

بچّوں کی طرح سے خواب دیکھیں
اور صبح اٹھیں تو بُھول جائیں

اِک مُٹھّی میں خاک بھرلیں اپنی
جب تیز ہوا چلے اُڑائیں

کل شب بھی چلی تھی ایک آندھی
اِس شب بھی ہیں تیزتر ہوائیں

اِس شور کے باوجود دن بھر
کرتا ہے یہ شہر سائیں سائیں



جیسے کسی دریا میں سرِ آب پرندے
لگتے ہیں مجھے انجم و مہتاب پرندے

بچوں کے لیے حیرتِ پرواز نہیں ہے
اِس شہر میں مدّت سے ہیں نایاب پرندے

کس دیس اُنھیں لے گئیں بیتاب اُڑانیں
آنکھوں کے نشیمن سے گئے خواب پرندے

میں ساحلِ افتادہ پہ خاموش کھڑا ہوں
دریا میں نہاتے ہیں سرِ آب پرندے

میں گوشۂ صحرا میں ہوں اور جوئے رواں ہوں
ہوتے ہیں مرے لمس سے سیراب پرندے

سوتے نہیں مدّت سے مرے شہر کے بچے
جیسے ہوں کسی خوف سے بے خواب پرندے

اس شاخ پہ جب سے وہ گُلِ سُرخ کھلا ہے
اِک رقصِ طرب کرتے ہیں بیتاب پرندے

یہ ربط کسی فصل کا پابند نہیں ہے
میں دریا ہوں اور ہیں مرے احباب پرندے



بن کے دُنیا کا تماشا معتبر ہو جائیں گے
سب کو ہنستا دیکھ کر ہم چشم تر ہو جائیں گے

مجھ کو قدروں کے بدلنے سے یہ ہو گا فائدہ
میرے جتنے عیب ہیں سارے ہنر ہو جائیں گے

آج اپنے جسم کو تو جس قدر چاہے چُھپا
رفتہ رفتہ تیرے کپڑے مختصر ہو جائیں گے

رفتہ رفتہ ان سے اُڑ جائے گی یکجائی کی بو
آج جو گھر ہیں وہ سب دیوار و در ہو جائیں گے

آتے جاتے رہرووں کو دیکھتا ہوں اس طرح
راہ چلتے لوگ جیسے ہم سفر ہو جائیں گے

آدمی خود اپنے اندر کربلا بن جائے گا
سارے جذبے خیر کے نیزوں پہ سر ہو جائیں گے

گرمیِ رفتار سے وہ آگ ہے زیرِ قدم
میرے نقشِ پا چراغِ رہگزر ہو جائیں گے

کیسے قصّے تھے کہ چھڑ جائیں تو اُڑ جاتی تھی نیند
کیا خبر تھی وہ بھی حرفِ مختصر ہو جائیں گے

کیا کہیں ایسے تقاضے ہیں محبّت کے تو ہم
اپنی بیتابی سے ہم رقصِ شرر ہو جائیں گے

ایک ساعت ایسی آئے گی کہ یہ وصل و فراق
میرے رنگِ بے دلی سے یک دگر ہو جائیں گے

کاخ و کوئے اہلِ دولت کی بِنا ہے ریت پر
اک دھماکے سے یہ سب زیر و زبر ہو جائیں گے

یہ عجب شب ہے انھیں سونے نہ دو ورنہ سلیم
خواب بچوں کے لیے وحشت اثر ہو جائیں گے

○

دِلوں میں دَرد بھرتا آنکھ میں گوہر بناتا ہوں
جنھیں مائیں پہنتی ہیں میں وہ زیور بناتا ہوں

غنیم وقت کے حملے کا مجھ کو خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں

پُرانی کشتیاں ہیں میرے ملّاحوں کی قسمت میں
میں اِن کے بادباں سیتا ہوں اور لنگر بناتا ہوں

یہ دھرتی میری ماں ہے اس کی عزّت مجھ کو پیاری ہے
میں اس کے سر چھپانے کے لیے چادر بناتا ہوں

یہ سوچا ہے کہ اب خانہ بدوشی کر کے دیکھوں گا
کوئی آفت ہی آتی ہے اگر میں گھر بناتا ہوں

حریفانِ فسوں گر مو قلم ہے میرے ہاتھوں میں
یہی میرا عصا ہے اس سے میں اژدر بناتا ہوں

مجھے ان سیپیوں کو دیکھ کر یوں ہی خیال آیا
یہ پانی سے میں اپنے خون سے گوہر بناتا ہوں

مرے خوابوں پہ جب تیرہ شبی یلغار کرتی ہے
میں کرنیں گوندھتا ہوں چاند سے پیکر بناتا ہوں

شب کو یہ سلسلہ ہے برسوں سے
گھر کا گھر جاگتا ہے برسوں سے

جانے کیا ہے کہ اُس ندی کے پار
اِک دیا جل رہا ہے برسوں سے

چلنے والے رُکے رہیں کب تک
راستہ بن رہا ہے برسوں سے

روز مل کر بھی کم نہیں ہوتا
دل میں وہ فاصلہ ہے برسوں سے

اب کے طرزِ تعلقات ہے اور
یوں تو وہ آشنا ہے برسوں سے

سوچ یہ ختم ہو نہ جائے کہیں
دل یہی سوچتا ہے برسوں سے

کس پتے پر اُسے تلاش کروں
شخص اِک کھو گیا ہے برسوں سے

کس کو آواز دے رہے ہو سلیم
شہر یہ سو رہا ہے برسوں سے

○

جانے کسی نے کیا کہا تیز ہوا کے شور میں
مجھ سے سُنا نہیں گیا تیز ہوا کے شور میں

میں بھی تجھے نہ سُن سکا، تو بھی مجھے نہ سُن سکا
تجھ سے ہوا مکالمہ تیز ہوا کے شور میں

کشتیوں والے بے خبر بڑھتے رہے بھنور کی سمت
اور میں چیختا رہا تیز ہوا کے شور میں

میری زبانِ آتشیں لَو تھی مرے چراغ کی
میرا چراغ چپ نہ تھا تیز ہوا کے شور میں

جیسے خروشِ بحر میں شورِ پرند ڈوب جائے
ڈوب گئی مری صدا تیز ہوا کے شور میں

نوحہ گرانِ شامِ غم تم نے سُنا نہیں مگر
کیسا عجیب درد تھا تیز ہوا کے شور میں

میرے مکاں کی چھت پہ تھے طائرِ شب ڈرے ڈرے
جیسے پیامِ مرگ تھا تیز ہوا کے شور میں

منّتِ گوشِ بے حِساں کون اٹھائے اب سلیم
نوحۂ غم مِلا دیا تیز ہوا کے شور میں

افق پر جا ملیں گے آسماں سے
یہ کتنا فاصلہ ہوگا یہاں سے

اندھیرے کے گھنیرے حاشیوں میں
یکایک روشنی آئی کہاں سے

ہوا نے دی درِ ویراں پہ دستک
کئی پرچھائیاں نکلیں مکاں سے

سلیقہ جس کو مرنے کا نہیں ہے
وہ اُٹھ جائے ہمارے درمیاں سے

یقیں کی بات میں کچھ بھی نہیں تھا
نئے پہلو ہوئے پیدا گماں سے

خموشی اُس گرہ کو کھولتی ہے
جو کھُل سکتی نہیں لفظ و بیاں سے

کبھی اپنی طرف بھی لَوٹ آنا
اگر فرصت ملے کارِ جہاں سے

میں موسم کے تقاضے دیکھتا تھا
سفر کی فال لی ابرِ رواں سے



یہ طلسم رنگ ہے یا سحر ہے تحریر کا
دمبدم چہرہ بدلتا ہے تری تصویر کا

دونوں ساتھی ہیں کسی اک قید سے بھاگے ہوئے
میرا تیرا ربط ہے یا جبر ہے زنجیر کا

اِس سرے سے اُس سرے تک دوڑنا آساں نہیں
میرے تیرے درمیاں اک دشت ہے تاخیر کا

لوگ جو تخریب کے الزام میں مارے گئے
اُن کی آنکھوں میں بھی کوئی خواب تھا تعمیر کا

بے خیالی میں لکیریں کھینچتا رہتا تھا میں
جانے کیسے بن گیا خاکہ تری تصویر کا

میں سمجھتا ہوں کہ میرے پاؤں ہیں میرے نصیب
میں جدھر جاؤں وہی ہے فیصلہ تقدیر کا

سانپ میرے گھر کے دروازے سے لپٹا تھا مگر
جھٹپٹے میں شام کے دھوکا ہوا زنجیر کا

کتنے لکھنے والے اس حسرت میں مٹّی ہو گئے
صفحۂ آبِ رواں پر نقش ہو تحریر کا

کِس کے حرفِ آتشیں سے لوحِ امکاں جل اٹھی
کِس کے ہاتھوں نے دِکھایا معجزہ تحریر کا

جانے کیسا خواب دیکھا تھا لڑکپن میں سلیمؔ
منتظر رہنا پڑا ہے عمر بھر تعبیر کا

کچھ بُرا نہیں لگتا کچھ بھلا نہیں لگتا
اب مجھے کسی شے میں بھی مزا نہیں لگتا

اس کے پیچھے اتنی دُور ہم چلے تو آئے ہیں
یہ کوئی بگولا ہے قافلا نہیں لگتا

کب تلک چلو گے یوں کوئی بات ہی چھیڑو
بات کرتے چلنے میں راستا نہیں لگتا

کھُب گئی ہے آنکھوں میں بستیوں کی ویرانی
جنگلوں کا سناٹا اب بُرا نہیں لگتا

جتنا آگے بڑھتا ہوں دور ہوتا جاتا ہے
یہ کوئی چھلاوا ہے یہ دیا نہیں لگتا

گمرہوں سے مت پوچھو کتنی دُور آئے ہیں
ایسے چلنے والوں کو فاصلا نہیں لگتا

ایک اجنبی کے ساتھ میں کہاں نکل آیا
یہ تو میری بستی کا راستا نہیں لگتا

○

نقش تو بنائے ہیں کچھ غزل کی صورت میں
یہ کتابِ فردا ہے دیکھیے گا فرصت میں

خیر و شر کی خبروں کو مانتے تو سب ہی ہیں
کس کو ہوش رہتا ہے جبر اور ضرورت میں

دونوں درد دیتی ہیں آہ سرد دیتی ہیں
فرق کچھ نہیں ایسا نفرت و محبّت میں

ہوتی ہے صداقت میں خامشی کی گہرائی
صرف شور ہوتا ہے حرفِ بے صداقت میں

دیکھ کر تجھے میں نے اور کچھ نہیں دیکھا
پھر بھی رنگ ہیں کتنے میری چشمِ حیرت میں

آسماں کے تاروں میں آگ یہ کہاں ہوگی
آدمی سُلگتا ہے آدمی کی حسرت میں

روشنی چراغوں کی دُور ہوتی جاتی ہے
جتنا آگے بڑھتے ہیں شب کو دشتِ وحشت میں

طاق بے دیاروں کے بے چراغ ہیں کب سے
اِک دیا جلا دینا شب کو شہرِ غربت میں



عمر ہوگئی آدھی صبر و جبر و وحشت میں
پھر نہیں مزا آیا دوسری محبت میں

بے شناخت لوگو تم اس سے دور ہی رہنا
ایک زہر ہوتا ہے حرف کی صداقت میں

اک بجھا دیا جیسے خود بخود سلگ اٹھے
اپنے گھر کی یاد آئی یوں دیارِ غربت میں

کتنے چہرے ملتے ہیں بھولتے نہیں برسوں
دور کے دیاروں کی اجنبی رفاقت میں

جانے کتنے سائے سے اس کی کو میں رقصاں تھے
اک دیا نظر آیا شب کو خوابِ وحشت میں

اے وفورِ گویائی دردِ بے نوائی دے
کیا کریں گے نغمے کو شہرِ بے سماعت میں

خود پسند و خود آرا ہیں مسرتیں لیکن
آدمی سے ملتا ہے آدمی مصیبت میں

آج جوشِ نغمہ سے آگ سی دلوں میں ہے
آبلے نہ پڑ جائیں سینۂ سماعت میں

ایک قبر کا مردہ دوسرے سے کہتا تھا
نیند کچھ ابھی لے لیں دیر ہے قیامت میں

○

اور کیا بتاؤں میں زندگی کی ظلمت میں
وہ چراغ روشن تھا آدمی کی صورت میں

زندگی کا رُخ جن سے دفعتاً بدل جائے
حادثے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں محبّت میں

جانے کتنے ہنگامے دل میں جاگ جاتے ہیں
جب کتابِ ماضی کو دیکھتا ہوں فرصت میں

ایک اجنبی چہرہ کھُب گیا ہے آنکھوں میں
جانے کس کو دیکھا ہے میں نے کس کی صورت میں

شہر اور نگر بدلے دشت اور گھر بدلے
فرق کچھ نہیں آیا آدمی کی حالت میں

اب نہ یادِ ماضی ہے اور نہ فکرِ مستقبل
صرف ہوش اتنا ہے زندہ ہوں اذیّت میں

اپنی اپنی منزل پر سب اُترتے جاتے ہیں
جیسے کچھ مسافر ہوں ریل کی رفاقت میں

عمرِ مختصر اپنی صرف عشق میں گزری
کتنے کام کر لیتے دو گھڑی کی فرصت میں

○

لمحۂ رفتہ کا دل میں زخم سا بن جائے گا
جو نہ پُر ہو گا کبھی ایسا خلا بن جائے گا

یہ نئے نقشِ قدم میرے بھٹکنے سے بنے
لوگ جب ان پر چلیں گے راستہ بن جائے گا

گونج سُننی ہو تو تنہا وادیوں میں چیخیے
ایک ہی آواز سے اِک سلسلہ بن جائے گا

جذب کر دے میری مٹّی میں لطافت کا مزاج
پھر وہ تیرے شہر کی آب و ہوا بن جائے گا

کھینچ لائے گی بگولوں کو یہ ویرانی مری
میری تنہائی سے میرا قافلہ بن جائے گا

اس میں لَو رکھ دوں گا میں جلتے ہوئے احساس کی
لفظ جو ہونٹوں سے نِکلے گا دیا بن جائے گا

جگنوؤں کی مشعلوں سے صحن کی دیوار پر
رقص کرتی روشنی کا دائرہ بن جائے گا

تلخیاں احساس کی جب خون میں گھُل جائیں گی
میرا چہرہ میرے غم کا آئنہ بن جائے گا

اِک برہمن نے یہ آ کے صحن مسجد میں کہا
عشق جس پتھّر کو چھُو لے وہ خدا بن جائے گا

ایک سیدھی بات ہے مِلنا نہ مِلنا عشق میں
اس پہ سوچو گے تو یہ بھی مسئلہ بن جائے گا

میرے سینے میں ابھی اِک جذبۂ بے نام ہے
ضبط کرتے کرتے حرفِ مُدعا بن جائے گا

دِل میں جو کچھ ہے وہ کہہ دو دوست سے ورنہ سلیمؔ
حرفِ ناگفتہ دِلوں کا فاصلہ بن جائے گا



بیٹھے ہیں سنہری کشتی میں اور سامنے نیلا پانی ہے
وہ ہنستی آنکھیں پوچھتی ہیں یہ کتنا گہرا پانی ہے

بے تاب ہوا کے جھونکوں کی فریاد سُنے تو کون سُنے
موجوں پہ تڑپتی کشتی ہے اور گونگا بہرا پانی ہے

ہر موج میں گریاں رہتا ہے، گرداب میں رقصاں رہتا ہے
بے تاب بھی ہے بے خواب بھی ہے یہ کیسا زندہ پانی ہے

بستی کے گھروں کو کیا دیکھے بنیاد کی حرمت کیا جانے
سیلاب کا شکوہ کون کرے سیلاب تو اندھا پانی ہے

اس بستی میں اس دھرتی پر سیرابیِ جاں کا حال نہ پوچھ
یاں آنکھوں آنکھوں آنسو ہیں اور دریا دریا پانی ہے

یہ راز سمجھ میں کب آتا آنکھوں کی نمی سے سمجھا ہوں
اس گرد و غبار کی دُنیا میں ہر چیز سے سچا پانی ہے



کوئی ستارۂ گرداب آشنا تھا میں
کہ موج موج اندھیروں میں ڈوبتا تھا میں

اُس ایک چہرے میں آباد تھے کئی چہرے
اُس ایک شخص میں کس کس کو دیکھتا تھا میں

نئے ستارے مری روشنی میں چلتے تھے
چراغ تھا کہ سرِ راہ جل رہا تھا میں

سفر میں عشق کے اِک ایسا مرحلہ آیا
وہ ڈھونڈتا تھا مجھے اور کھو گیا تھا میں

تمام عمر کا حاصل سراب و تشنہ لبی
مرا قصور یہی تھا کہ سوچتا تھا میں

بگڑ رہا تھا میں دنیا کے زاویے سے مگر
اک اور زاویہ تھا جس سے بن رہا تھا میں

نہیں رہا میں ترے راستے کا پتھر بھی
وہ دن بھی تھے ترے احساس میں خدا تھا میں

مجھے گلہ نہ کسی سنگ کا نہ آہن کا
اُسی نے توڑ دیا جس کا آئنہ تھا میں



وہ خواب تھا کہ حقیقت تھا یا تماشا تھا
تمام عمر اسی مسئلے پہ سوچا تھا

وہ گم ہوا تو مضامین ہو گئے بے ربط
وہی تو تھا جو مرا مرکزی حوالہ تھا

وہ صرف اپنے حدود و قیود کا نکلا
اس ایک شخص کو کیا کیا سمجھ کے چاہا تھا

مکاں بنا کے اسے بند کر دیا ورنہ
یہ راستہ کسی منزل کو جانے والا تھا

میں تہ نشیں تھا کہ باقی تھی زندگی مجھ میں
جو مر گئے تھے اُنھیں موج نے اچھالا تھا

اُسے تو جانا کسی اور سمت تھا لیکن
مجھے وہ چھوڑنے میرے مکاں تک آیا تھا

پھر اُس کے بعد مری گمرہی کا قصّہ ہے
میں اُس مقام پہ پہنچا جہاں دوراہا تھا

سکوں ہوا تو مگر صرف ایک پل کے لیے
ترا خیال بھی ابرِ رواں کا سایا تھا

وہ اِک ستارۂ گردوں نژاد تھا کوئی
اگرچہ مادرِ گیتی نے اُس کو پالا تھا

اندھیرا تھا کہ برستا تھا آسماں سے مگر
شبِ سیاہ کا وہ آخری سنبھالا تھا

چہک رہا تھا جو آنگن کے پیڑ پر سرِ شام
کہیں سے آیا ہوا موسمی پرندہ تھا

اگر کسی سے کہوں بھی تو کون مانے گا
جو گُم ہوا ہے زمیں میں وہ ایک دریا تھا

اسی طرح مرے بچّے بھی رقص کرتے ہیں
فضا میں جگنوؤں نے دائرہ بنایا تھا

میں رات چھت پہ کھڑا دیکھتا تھا تارے کو
یہ ایک ساتھ بھی سب کے تھا پھر بھی تنہا تھا

اب اس کے سوگ میں کچھ اور کیا کہیں ہم لوگ
کہ مرنے والا تو ہم سے زیادہ زندہ تھا



نجانے شعر میں کس درد کا حوالہ تھا
کہ جو بھی لفظ تھا وہ دِل دکھانے والا تھا

افق پہ دیکھتا تھا میں قطار قازوں کی
مرا رفیق کہیں دُور جانے والا تھا

مرا خیال تھا یا کھولتا ہوا پانی
مرے خیال نے برسوں مجھے اُبالا تھا

ابھی نہیں ہے مجھے سرد و گرم کی پہچان
یہ میرے ہاتھوں میں انگارا تھا کہ ژالہ تھا

میں آج تک کوئی ویسی غزل نہ لکھ پایا
وہ سانحہ تو بہت دل دُکھانے والا تھا

معانیِ شبِ تاریک کھُل رہے تھے سلیم
جہاں چراغ نہیں تھا وہاں اُجالا تھا



دُکھ دے یا رسوائی دے
غم کو مرے گہرائی دے

اپنے لمس کو زندہ کر
ہاتھوں کو بینائی دے

مجھ سے کوئی ایسی بات
بِن بولے جو سُنائی دے

جتنا آنکھ سے کم دیکھوں
اُتنی دُور دکھائی دے

اس شِدّت سے ظاہر ہو
اندھوں کو بھی سُجھائی دے

افق افق گھر آنگن ہے
آنگن پار رسائی دے



آج تو نہیں ملتا اور چھور دریا کا
تو بھی آ کے ساحل پر دیکھ زور دریا کا

میرا شورِ غرقابی ختم ہو گیا آخر
اور رہ گیا باقی صرف شور دریا کا

میرے جرم سادہ پر تشنگی بھی ہنستی ہے
ایک گھونٹ پانی پر میں ہوں چور دریا کا

مور اور بھنور دونوں محوِ رقص رہتے ہیں
یہ بھنور ہے جنگل کا وہ ہے مور دریا کا



ملا جو کام غمِ معتبر بنانے کا
ہنر اُس آنکھ کو آیا گہر بنانے کا

تجھی سے خواب ہیں میرے تجھی سے بیداری
تجھے سلیقہ ہے شام و سحر بنانے کا

میں اپنے پیچھے ستاروں کو چھوڑ آیا ہوں
مجھے دماغ نہیں ہم سفر بنانے کا

یہ میرے ہاتھوں میں پتھر ہیں اور رات ہے سرد
میں کام لیتا ہوں ان سے شرر بنانے کا

سرائے میں کوئی اک شب رکے تو بات ہے اور
مگر سوال ہے دنیا کو گھر بنانے کا

مکاں کے نقشے پہ دیوار لکھ دیا کس نے
یہاں تو میرا ارادہ تھا دَر بنانے کا

یہ اور بات کہ منزل فریب تھا لیکن
ہنر وہ جانتا تھا ہم سفر بنانے کا

وہ لوگ کشتی و ساحل کی فکر کیا کرتے
جنھیں ہے حوصلہ دریا میں گھر بنانے کا

ہر ایک تخم کو رزقِ شکم پُری نہ سمجھ
ہُنر بھی سیکھ زمیں سے شجر بنانے کا

بہت طویل مری داستانِ غم تھی مگر
غزل سے کام لیا مختصر بنانے کا

○

زندگی موت کے پہلو میں بھلی لگتی ہے
گھاس اِس قبر پہ کچھ اور ہری لگتی ہے

روز کاغذ پہ بناتا ہوں میں قدموں کے نقوش
کوئی چلتا نہیں اور ہمسفری لگتی ہے

آنکھ مانوسِ تماشا نہیں ہونے پاتی
کیسی صورت ہے کہ ہر روز نئی لگتی ہے

گھاس میں جذب ہوئے ہوں گے زمیں کے آنسو
پاؤں رکھتا ہوں تو ہلکی سی نمی لگتی ہے

سچ تو کہہ دوں مگر اس دَور کے انسانوں کو
بات جو دل سے نکلتی ہے بُری لگتی ہے

میرے شیشے میں اُتر آئی ہے جو شامِ فراق
وہ کسی شہرِ نگاراں کی پری لگتی ہے

بوند بھر اشک بھی ٹپکا نہ کسی کے غم میں
آج ہر آنکھ کوئی ابرِ تہی لگتی ہے

شورِ طفلاں بھی نہیں ہے نہ رقیبوں کا ہجوم
لَوٹ آؤ یہ کوئی اور گلی لگتی ہے

گھر میں کچھ کم ہے یہ احساس بھی ہوتا ہے سلیمؔ
یہ بھی کھلتا نہیں کس شے کی کمی لگتی ہے



ربط ٹوٹ جاتا ہے سلسلا نہیں ملتا
مجھ کو دھیان گلیوں میں راستا نہیں ملتا

اس قطارِ روشن میں اک کمی سی لگتی ہے
جس پہ نام تھا تیرا وہ دیا نہیں ملتا

سب کو ایک حسرت ہے دوسرے کے ملنے کی
سب کو اک شکایت ہے دوسرا نہیں ملتا

دل میں ہو تو کچھ کہیئے جب نہ ہو تو کیا کہیے
لفظ مل بھی جاتے ہیں مدّعا نہیں ملتا

کتنا تنگ کرتی ہیں یہ بھری پُری سڑکیں
اتنے لوگ چلتے ہیں راستا نہیں ملتا

جس کی آنکھ پتھر ہو جس کا دِل لہو روئے
اُس سوا کسی کو بھی دیکھنا نہیں ملتا

یوں تو شہر میں تیرے دوست بھی ہیں دشمن بھی
آدمی کوئی اپنے کام کا نہیں ملتا

مجھ سے کی مسافر نے راستے میں سرگوشی
کب سے ڈھونڈتا ہوں میں اور خدا نہیں ملتا

شب کو چائے خانوں میں اب بھی بھیڑ ہوتی ہے
ہاں مگر کوئی چہرہ آشنا نہیں ملتا

میں دیے جلاتا ہوں طاقِ غم گساری میں
گو دیے جلانے کا کچھ صِلا نہیں ملتا



آنکھوں میں ستارے سے چمکتے رہے تا دیر
اک گھر کے دَر و بام کو تکتے رہے تا دیر

آنسو تو ہوئے خشک پہ گریہ رہا جاری
بچوّں کی طرح رو کے سِسکتے رہے تا دیر

اُس شاخ سے اک مارِ سیہ لپٹا ہوا تھا
لیکن وہیں طائر بھی چہکتے رہے تا دیر

کیا لمس تھا اُس دستِ حنائی کا تہ آب
انگارے سے ہاتھوں میں دہکتے رہے تا دیر

اِک آگ سی جلتی رہی تا عمر لہو میں
ہم اپنے ہی احساس میں پکتے رہے تا دیر

وہ گرمیِ انفاس وہ جاڑے کی خنک رات
احساس میں شعلے سے لپکتے رہے تا دیر



یہ جو اِک صورت ہے اب پتھر کے بیچ
نقش تھی پہلے دلِ آزر کے بیچ

دیکھنا ہے اب دیے کے زور کو
لا کے رکھ دوں گا ہوا میں دَر کے بیچ

آنکھ ہے نادیدگاں کی منتظر
اِک کمی لگتی ہے ہر منظر کے بیچ

وہ لباسِ دَرد میں ملبوس تھا
سیکڑوں پیوند تھے چادر کے بیچ

کیا بتاؤں کیوں ہوئی مجھ کو شکست
میرا دشمن تھا مرے لشکر کے بیچ

کس نے دل میں رکھ دیے یہ فاصلے
کس نے دیواریں اٹھا دیں دَر کے بیچ

نشّے کے اسرار ہیں، کھلتا نہیں
موج ہے یا سانپ ہے ساغر کے بیچ

یہ دَر و دیوار ہیں رختِ سفر
میں مسافر ہوں خود اپنے گھر کے بیچ

یہ سمندر یہ سنہری کشتیاں
کاش ہوتا تو بھی اِس منظر کے بیچ

بیٹھ کے صوفے پہ اٹھلانا ہے جو
کھینچیے اُس کو کبھی بستر کے بیچ



وہ میرا یار دیوانہ بہت تھا رنگ و نکہت کا
سو اُس کی قبر پر کچھ پھول رکھے اور لوٹ آیا

میں اُس کی رنگ موجوں میں کبھی ڈوبا کبھی اُبھرا
بدن تھا یا شبِ مہتاب میں بہتا ہوا دریا

ترے بارے میں میں اِس کے سوا کچھ اور کیا کہتا
نظر کچھ بھی نہ آیا اس قدر نزدیک سے دیکھا

مجھے اِک مصرعِ موزوں بنایا حُسنِ فن بخشا
وہ میرا سوچنے والا کوئی شاعر رہا ہوگا

وہ ہر چہرے کے خدّوخال کو پہچان لیتا ہے
مگر دیکھو تو آئینے کا خود کوئی نہیں چہرا

وہ شامِ بے بسی کیسی اُداسی لے کے آئی تھی
اندھیرا بڑھ رہا تھا اور دیا میں نے جلایا تھا



وہ مرے دل کی روشنی وہ مرے داغ لے گئی
ایسی چلی ہوائے شام سارے چراغ لے گئی

شاخ و گل و ثمر کی بات کون کرے کہ ایک رات
بادِ شمال آئی تھی باغ کا باغ لے گئی

وقت کی موج تُند رَو آئی تھی سوئے میکدہ
میری شراب پھینک کر میرے ایاغ لے گئی

دل کا حساب کیا کریں دِل تو اُسی کا مال تھا
نکہتِ زلفِ عنبریں اب کے دماغ لے گئی

باغ تھا اُس میں حوض تھا، حوض تھا اُس میں پھول تھا
غیر کی بے بصیرتی مجھ سے سراغ لے گئی



ستارہ حرف بناتے ہیں خواب لکھتے ہیں
تمھارے نام پر اک انتساب لکھتے ہیں

حیات سب کے لیے اک سوال لاتی ہے
تمام عمر اُسی کا جواب لکھتے ہیں

میں اِن کو حرف بناتا ہوں اور پڑھتا ہوں
یہ حادثے مرے دل میں کتاب لکھتے ہیں

عجیب رنگ، ہیں ان کے عجیب تحریریں
یہ روز و شب مری آنکھوں میں خواب لکھتے ہیں

سمندروں کو بھی لب تشنگانِ بے پروا
غرورِ تشنہ لبی سے سراب لکھتے ہیں

ہم ایک حرف کو بھی رائیگاں نہیں لکھتے
بیادِ کم سُخناں انتخاب لکھتے ہیں

بُرا نہ مان کہ یہ شاعروں کی باتیں ہیں
یہ لوگ اپنے عذاب و ثواب لکھتے ہیں

سلیمؔ میرے حریفوں میں یہ خرابی ہے
کہ جھوٹ بولتے ہیں اور خراب لکھتے ہیں



جو دِل میں ہیں داغ جل رہے ہیں
مسجد میں چراغ جل رہے ہیں

جس آگ سے دل سُلگ رہے تھے
اب اس سے دماغ جل رہے ہیں

بچپن مرا جن میں کھیلتا تھا
وہ کھیت وہ باغ جل رہے ہیں

چہرے پہ ہنسی کی روشنی ہے
آنکھوں میں چراغ جل رہے ہیں

رستوں میں وہ آگ لگ گئی ہے
قدموں کے سُراغ جل رہے ہیں



شفق کے رنگ سے برگ و ثمر گلابی ہیں
سنہری شام ہے سارے شجر گلابی ہیں

یہ کون ہے جو مرے گھر میں رنگ لے آیا
یہ کس کے عکس سے دیوار و در گلابی ہیں

یہ کس کا دستِ حنائی ہے میری آنکھوں پر
کہ میرے خوابوں کے سارے نگر گلابی ہیں

سنہری بالوں پہ ہلکی سی دھوپ پڑتی ہے
سفید برف سے چہرے ہیں سر گلابی ہیں



ہے کبھی سایہ کبھی ہے روشنی دیوار پر
رنگ بکھراتی ہے کیا کیا زندگی دیوار پر

دونوں ہمسایوں میں ویسے تو محبت ہے بہت
ایک جھگڑا پڑ گیا ہے بیچ کی دیوار پر

میں اندھیرے میں کھڑا حیرت سے پڑھتا ہوں اسے
اک عبارت لکھ رہی ہے روشنی دیوار پر

ہم سمجھتے تھے ہمارے بام و در ڈھل جائیں گے
بارشیں آئیں تو کائی جم گئی دیوار پر

اک اُدھورا نام، کچھ مدھم لکیریں، کچھ حروف
یہ مکینوں کی نشانی رہ گئی دیوار پر

اس جگہ شاید کبھی اُس کا بسیرا ہو سلیم
ایک چڑیا دیر تک بیٹھی رہی دیوار پر



جو آنکھوں کے تقاضے ہیں وہ نظارے بناتا ہوں
اندھیری رات ہے کاغذ پہ میں تارے بناتا ہوں

محلّے والے میرے کارِ بے مصرف پہ ہنستے ہیں
میں بچوّں کے لیے گلیوں میں غبارّے بناتا ہوں

وہ لوری گائیں گی اور ان میں بچوّں کو سلائیں گی
میں ماؤں کے لیے پھولوں کے گہوارے بناتا ہوں

فضائے نیلگوں میں حسرتِ پرواز تو دیکھو
میں اڑنے کے لیے کاغذ کے طیارّے بناتا ہوں

مجھے رنگوں سے اپنے حیرتیں تخلیق کرنی ہیں
کبھی تتلی کبھی جگنو کبھی تارے بناتا ہوں

زمیں یخ بستہ ہو جاتی ہے جب جاڑوں کی راتوں میں
میں اپنے دل کو سلگاتا ہوں انگارے بناتا ہوں

ترا دستِ حنائی دیکھ کر مجھ کو خیال آیا
میں اپنے خون سے لفظوں کے گل پارے بناتا ہوں

مجھے اِک کام آتا ہے یہ لفظوں کے بنانے کا
کبھی میٹھے بناتا ہوں کبھی کھارے بناتا ہوں

بلندی کی طلب ہے اور اندر انتشار اتنا
سو اپنے شہر کی سڑکوں پہ فوارے بناتا ہوں



ہر آنکھ کا حاصل دُوری ہے
ہر منظر اِک مستوری ہے

جو سود و زیاں کی فکر کرے
وہ عشق نہیں مزدوری ہے

سب دیکھتی ہیں سب جھیلتی ہیں
یہ آنکھوں کی مجبوری ہے

اِس ساحل سے اُس ساحل تک
کیا کہیئے کتنی دُوری ہے

یہ قُرب حباب و آب کا ہے
یہ وصل نہیں مہجوری ہے

میں تجھ کو کتنا چاہتا ہوں
یہ کہنا غیر ضروری ہے



فصلِ گل آئی ہے یادوں میں دِیے جلتے ہیں
دل دہک اٹھتا ہے زخموں میں دِیے جلتے ہیں

شہرِ احساس ترے لمس سے جاگ اٹھتا ہے
رات آتی ہے تو ہاتھوں میں دِیے جلتے ہیں

روشنی سبز درختوں پہ اُتر آتی ہے
پھول کِھلتے ہیں تو شاخوں میں دِیے جلتے ہیں

اِک اُجالے کو سُخن کرتے سُنا ہے میں نے
ہونٹ لَو دیتے ہیں لفظوں میں دِیے جلتے ہیں

یہ ترے نقشِ قدم ہیں کہ ستارے ہیں کہ پھول
تو گزرتا ہے تو رستوں میں دِیے جلتے ہیں

فِکر اک عمر میں احساس میں حل ہوتی ہے
بڑی مشکل سے دماغوں میں دِیے جلتے ہیں



دیکھنے کے لیے اِک شرط ہے منظر ہونا
دوسری شرط ہے پھر آنکھ کا پتھّر ہونا

وہاں دیوار اُٹھا دی مرے معماروں نے
گھر کے نقشے میں مقرّر تھا جہاں دَر ہونا

مجھ کو دیکھا تو فلک زاد رفیقوں نے کہا
اس ستارے کا مقدّر ہے زمیں پر ہونا

باغ میں یہ نئی سازش ہے کہ ثابت ہو جائے
برگِ گل کا خس و خاشاک سے کمتر ہونا

میں بھی بن جاؤں گا پھر سحرِ ہَوا سے کشتی
رات آجائے تو پھر تم بھی سمندر ہونا

وہ مرا گرد کی مانند ہوا میں اُڑنا
پھر اُسی گرد سے پیدا مرا لشکر ہونا

در بدر ٹھوکریں کھائیں تو یہ معلوم ہوا
گھر کسے کہتے ہیں کیا چیز ہے بے گھر ہونا

کیسا گرداب تھا وہ ترکِ تعلق تیرا
کام آیا نہ مرے میرا شناور ہونا

تم تو دشمن بھی نہیں ہو کہ ضروری ہے سلیم
میرے دشمن کے لیے میرے برابر ہونا



آئینے کا اب آب چہرہ
بے عکس بنا سراب چہرہ

شاخوں پہ خیال کی کھلا ہے
بھولا ہوا اِک گلاب چہرہ

یادوں کے اُفق سے جھانکتا ہے
وہ زرد سا ماہتاب چہرہ

میں نیند میں خواب دیکھتا ہوں
بے خواب ہے خواب خواب چہرہ

میں حرف شناس بھی نہیں ہوں
پڑھتا ہوں مگر کتاب چہرہ

وہ رات ہے اور ہاتھ تیرے
اور ہاتھ میں آفتاب چہرہ



بھیجتی ہیں جو پیامِ روشنی تاروں کے نام
رات میں نے اک غزل لکھی ہے اُن آنکھوں کے نام

کل کے اخباروں میں چھپ جائے گی یہ تازہ خبر
کشتیاں، ساحل کا منظر، ڈوبنے والوں کے نام

جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہیں اُس کی حیرتیں
میرا بچّہ پوچھتا ہے رات کو تاروں کے نام

جانے اس گھر کے مکیں کس دیس پہنچے کیا ہوئے
رہ گئے دیوار پر لکھّے ہوئے بچّوں کے نام

رنگ و بو کے کتنے مُردہ تجربے زندہ ہوئے
یاد آئے دیکھ کر تجھ کو کئی پھولوں کے نام

میں نے دریا میں بہائے جاگتے سوتے دِیے
کچھ تری صبحوں کے نام اور کچھ تری شاموں کے نام



ایک اِمکاں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے دل کے پاس
دل کی دولت خواب ہیں اور خواب مستقبل کے پاس

کل جنھیں رخصت کیا تھا وہ مسافر کیا ہوئے
کشتیاں ٹوٹی ہوئی لوٹ آئی ہیں ساحل کے پاس

میں پلٹ آؤں گا صحرا میں بھٹکنے کے لیے
قافلہ میرا پہنچ جائے گا جب منزل کے پاس

میری خوں آلودہ آنکھوں نے یہ منظر بھی سہا
جو مرا ساتھی تھا، بیٹھا تھا مرے قاتل کے پاس

مجھ سے وہ طالب محبّت کا ہے اور واقف ہوں میں
مجھ سے یہ دولت زیادہ ہے مرے سائل کے پاس

عقلِ پختہ کار کو جن کی خبر تک بھی نہیں
اپنے کاموں کی ہیں کچھ ایسی دلیلیں دل کے پاس

کوئی پُورا کر نہیں سکتا جسے اس کے سوا
ایک ایسی بات ہے ہر ناقص و کامل کے پاس



اپنی موجِ مستی میں مَیں بھی ایک دریا ہوں
پھر بھی پاسِ صحرا سے اپنی حد میں بہتا ہوں

اپنی دید سے اندھا، اپنی گونج سے بہرا
سب کو دیکھ لیتا ہوں سب کی بات سنتا ہوں

مجھ میں کس نے رکھ دی ہے یہ محال کی خواہش
میں کہ ریگِ صحرا کو چھلنیوں میں بھرتا ہوں

گو چراغِ روشن ہوں پر ہوں رائیگاں اِتنا
ایک طاق میں رکھّا دوپہر میں جلتا ہوں

ڈوبنے کا ڈر ہونا چاہیے سفینوں کو
مجھ کو خوفِ طوفاں کیا میں تو ایک تنکا ہوں

میرے پاس آتے ہیں مجھ سے خوف کھاتے ہیں
میں ہجومِ طفلاں میں سانپ کا تماشا ہوں



کل نشاطِ قرب سے موسم بہار اندازہ تھا
کچھ ہوا بھی نرم تھی کچھ رنگِ گل بھی تازہ تھا

تھک کے سنگِ راہ پر بیٹھے تو اُٹھے ہی نہیں
حد سے بڑھ کر تیز چلنے کا یہی خمیازہ تھا

آئینہ دونوں کے آگے رکھ دیا تقدیر نے
میرے چہرے پر لہو تھا روئے گل پر غازہ تھا

مجھ کو ملاحوں کے گیتوں سے محبت ہے مگر
رات ساحل پر ہوا کا شور بے اندازہ تھا

اب تو کچھ دکھ بھی نہیں ہے داغ بھی جاتا رہا
کل اسی دل میں یہیں اِک زخم تھا اور تازہ تھا

گو یقینی تو نہیں تھے میرے تخمینے مگر
جو تجھے پیش آیا اُس کا کچھ مجھے اندازہ تھا

میرے اوراقِ پریشاں دیکھنے والے کبھی
میں کتابِ عشق تھا اور دل مرا شیرازہ تھا

آنکھ میں اس کی چمک تھی پر ہوسناکی بھی تھی
رنگ اُس کے رُخ پہ تھا لیکن رہینِ غازہ تھا

جوشِ گریہ میرے رونے کا یہ شورِ بازگشت
کچھ نہ تھا اِک کوچہ گردِ صبر کا آوازہ تھا

جانے اندر کیا ہوا میں شور سُن کر اے سلیم
اُس جگہ پہنچا تو دیکھا بند یہ دروازہ تھا



بارہا شب کو یوں لگا ہے مجھے
کوئی سایہ پکارتا ہے مجھے

جیسے یہ شہر کل نہیں ہوگا
جانے کیا وہم ہوگیا ہے مجھے

میں ستاروں کا ایک نغمہ ہوں
بیکراں رات نے سُنا ہے مجھے

میں ادھورا سا ایک جملہ ہوں
اہتماماً کہا گیا ہے مجھے

دُکھ ہے، احساسِ جرم ہے، کیا ہے
کوئی اندر سے توڑتا ہے مجھے

جیسے میں دیکھتا ہوں آئینہ
یوں ہی آئینہ دیکھتا ہے مجھے

جب میں باتوں سے ٹوٹ جاتا ہوں
کوئی ہونٹوں سے جوڑتا ہے مجھے

سازشیں یہ کسی چراغ کی ہیں
میرا سایہ ڈرا رہا ہے مجھے

وہ مجھے پوچھنے کو آیا تھا
حال اپنا سُنا رہا ہے مجھے

جانے وہ کون تھا دیے کی طرح
راستے میں جلا گیا ہے مجھے

نیند کے حاشیوں میں پچھلے پہر
اک ستارا پکارتا ہے مجھے

اُس نے کیسا سجا سجا کے سلیم
اِک غزل کی طرح لکھا ہے مجھے

○

چھایا ہوا تھا رنگِ غم دل پہ غبار کی طرح
میں نے اسی غبار سے ڈالی بہار کی طرح

رنج ہزار ہا سہی دِل نہ دُکھے تو کیا علاج
بے حس ویے نیال ہوں سنگِ مزار کی طرح

چلتا ہوں اپنے زور میں مرکبِ وقت کے بغیر
سعی و عمل کی نئے پہ ہوں طفلِ سوار کی طرح

زورِ ہوا سے اُڑ گئے حبسِ ہوا سے گھٹ گئے
قافلۂ حیات میں ہم ہیں غبار کی طرح

میری بہائے فن ہے یہ مجھ سے ہے کارِ زرگراں
رکھا گیا دکان میں مجھ کو عیار کی طرح

دِل سے غمِ حیات کو عشق سے کھینچ لیجیے
بعد میں پھینک دیجیے دونوں کو خار کی طرح

حالتِ یاس اور گناہ دِل میں کوئی خیال سا
رات کی تیرگی میں ہے دیدۂ مار کی طرح

اب مرے برگ و بار میں باقی نہیں نم و نمو
تو مری زندگی میں تھا فصلِ بہار کی طرح



عمر اپنی جہاں جہاں گزری
اچھے لوگوں کے درمیاں گزری

کٹ گئی انتظارِ فردا میں
کیسے کہیے کہ رائیگاں گزری

ساتھ گزرا ہجومِ نوحہ گراں
دل سے جب یادِ رفتگاں گزری

بات کرتے میں ایک پرچھائیں
تیری آنکھوں کے درمیاں گزری

ہر صدائے نفس تھی بانگِ جرس
زندگی مثلِ کارواں گزری

دِن کٹا تھا تمازتوں میں سلیم
شام ہو کر دھواں دھواں گزری



چین نہیں ہے دل کو جب رات کٹے گی کس طرح
ہم نفسانِ نیم شب رات کٹے گی کس طرح

ساعتِ وعدہ کٹ گئی آ کے خوشی پلٹ گئی
دل کو سکوں نہیں ہے اب رات کٹے گی کس طرح

وجہ کوئی نہیں مگر صبح سے میں اُداس ہوں
وہ بھی خفا ہے بے سبب رات کٹے گی کس طرح

شامِ ملال ہے تہی یادِ شبِ وصال سے
دل میں نہیں کوئی طلب رات کٹے گی کس طرح

صبح سے کیوں خفا ہے تو شام کو کیوں ملا نہیں
میں نے کہا تھا تجھ سے کب رات کٹے گی کس طرح

ہجر کے غم میں آنکھ سے طائرِ خواب اُڑ گیا
حال ہے شام سے عجب رات کٹے گی کس طرح

اب وہ سرورِ مے کہاں ، نغمہ گروں کی لے کہاں
بادہ کشانِ تشنہ لب رات کٹے گی کس طرح



کچھ ہیں منظر حال کے کچھ خواب مستقبل کے ہیں
یہ تمنّا آنکھ کی ہے وہ تقاضے دِل کے ہیں

ہم نے یہ نیرنگیاں بھی دہر کی دیکھیں کہ لوگ
دوست ہیں مقتول کے اور ہمنوا قاتل کے ہیں

عمر ساری راہ کے پتھر ہٹاتے کٹ گئی
زخم میرے ہاتھ میں اِک سعیِ لا حاصل کے ہیں

اِک دھنک لہرا رہی ہے آنسوؤں کے درمیاں
میری آنکھوں میں ابھی تک رنگ اُس محفل کے ہیں

اِس سے آگے کون جائے دشتِ نامعلوم ہیں
ہم نہ کہتے تھے کہ سارے ہمسفر منزل کے ہیں

اُن کو طوفانوں سے کیا مطلب بھنور سے کیا غرض
دوست جتنے ہیں تماشائی فقط ساحل کے ہیں

تو جسے اپنا سمجھتا ہے وہ مالِ غیر ہے
تیرے ہاتھوں میں جو سکّے ہیں کسی سائل کے ہیں

جانچتی ہے غیر کو ہر لحظہ چشمِ عیب جو
نقش مجھ میں جتنے ہیں سارے کسی کامل کے ہیں

○

دِل کے اندر دِرد آنکھوں میں نمی بن جائیے
اس طرح ملیے کہ جزوِ زندگی بن جائیے

اِک پتنگے نے یہ اپنے رقصِ آخر میں کہا
روشنی کے ساتھ رہیے روشنی بن جائیے

جس طرح دریا بُجھا سکتے نہیں صحرا کی پیاس
اپنے اندر ایک ایسی تشنگی بن جائیے

دیوتا بننے کی حسرت میں معلّق ہو گئے
اَب ذرا نیچے اُتریے آدمی بن جائیے

جس طرح خالی انگوٹھی کو نگینہ چاہیے
عالمِ امکاں میں اک ایسی کمی بن جائیے

عقلِ کُل بن کر تو دنیا کی حقیقت دیکھ لی
دِل یہ کہتا ہے کہ اب دیوانگی بن جائیے

وسعتوں میں لوگ کھو دیتے ہیں خود اپنا شعور
اپنی حد میں آئیے اور آگہی بن جائیے

حسنِ معنی کیوں رہے حرف و صدا کی قید میں
ماورائے گوش و لب، اِک اَن کہی بن جائیے

عالمِ کثرت نہاں ہے اس اکائی میں سلیم
خود میں خود کو جمع کیجے اور کئی بن جائیے

○

وہ ہاتھ ہاتھ میں آیا ہے آدھی رات کے بعد
دِیا دیے سے جلایا ہے آدھی رات کے بعد

مَیں آدھی رات تو تیرہ شبی میں کاٹ چکا
چراغ کس نے جلایا ہے آدھی رات کے بعد

مَیں جانتا ہوں کہ سب سو رہے ہیں محفل میں
فسانہ میں نے سنایا ہے آدھی رات کے بعد

ستارے جاگ اُٹھے ہیں کسی کی آہٹ سے
یہ کون ہے کہ جو آیا ہے آدھی رات کے بعد

مجھے خبر بھی نہیں ہے کہ شب نوردوں نے
مجھے کہاں سے اُٹھایا ہے آدھی رات کے بعد

ہوا تھا شامِ خیال و ملال سے آغاز
وہی دیا وہی سایا ہے آدھی رات کے بعد

یہاں تو کوئی نہیں ہے، ہوا، نہ تُو، نہ چراغ
یہ مُجھ کو کِس نے جگایا ہے آدھی رات کے بعد

کبھی جو دن کو بھی ملتا نہیں اکیلے میں
اُسی نے مُجھ کو بُلایا ہے آدھی رات کے بعد

○

یہ زمیں یہ چاند یہ سورج یہ تارے دیکھنا
حُسنِ نادیدہ کے سارے استعارے دیکھنا

اِک خبر دینا کسی آتے ہوئے طوفان کی
کشتیوں کو جب کبھی دریا کنارے دیکھنا

جنوری کی سردیوں میں ایک آتشداں کے پاس
گھنٹوں تنہا۔ بیٹھنا بُجھتے شرارے دیکھنا

جب کبھی فرصت مِلے تو گوشۂ تنہائی میں
یادِ ماضی کے پُرانے گوشوارے دیکھنا

میرے ماضی کے رسالوں کو نہ کھو دینا سلیم
اب کہیں ملتے نہیں ہیں یہ شمارے دیکھنا

○

خیر کا تجھ کو یقیں ہے اور اس کو شر کا ہے
دونوں حق پر ہیں کہ جھگڑا صرف پس منظر کا ہے

آنسوؤں سے تو ہے خالی درد سے عاری ہوں میں
تیری آنکھیں کانچ کی ہیں میرا دل پتھر کا ہے

کون دفناتا اُسے وہ اِک برہنہ لاش تھی
سب نے پوچھا کون ہے وہ کون سے لشکر کا ہے

تُو سکوں سے تھک گیا ہے اور بیتابی سے میں
شوق ہے تجھ کو سفر کا اور مجھ کو گھر کا ہے

ایک پودا صحن میں تھا دھوپ کھا کر جل گیا
صرف میرا ہی نہیں ہے رنج یہ گھر بھر کا ہے

سوچتا رہتا ہوں میں تیری اُڑانیں دیکھ کر
یہ ہوا کا زور ہے یا تیرے بال و پَر کا ہے

ایک بوڑھے نے کیا عصرِ رواں پر تبصرہ
یہ زمانہ آدمی کا ہے کہ زور و زر کا ہے

میں نے سینچا ہے لہو سے اس دلِ سرسبز کو
عمر بھر سے یہ علاقہ میری چشمِ تر کا ہے

میں سمٹ کر لیٹتا ہوں بسترِ ادراک پر
پاؤں پھیلاؤں تو اندیشہ مجھے چادر کا ہے

اس مسافت کا مداوا تجھ سے بھی ممکن نہیں
زخمِ دل سے کچھ زیادہ زخم میرے سر کا ہے

اک طبیبِ آدمیت نے کہا ہے صاف صاف
زہر دنیا کی رگوں میں سب فسادِ زر کا ہے

دیکھ کر انسان کو کہتی ہے ساری کائنات
یہ تو ہم میں سے نہیں ہے، یہ کوئی باہر کا ہے

ساری کڑیاں توڑ دیں میں نے محبت کے سوا
کون توڑے گا اسے یہ جبر تو اندر کا ہے